مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۱ | شعبان ۱۴۴۱ھ | اپریل ۲۰۲۰ء | شمارہ ۴

الرحیل الی الخلیل

سفر آخرت

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
35422213
35433049
پتہ دفتر جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/۲۰ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

الرحیل الی الخلیل
(سفر آخرت)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت نے وعظ ''الرحیل الی الخلیل'' دین پر چلنے کے متعلق خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۲۴ جمادی الاول ۱۳۴۹ ہجری ۳ گھنٹہ کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا، جسے مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند کیا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی۔ حضرت تھانویؒ نے یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ دنیا میں انسان دراصل مسافر ہے آخرت کا، جیسے مسافر ادھر ادھر کے مناظر میں محو ہو کر اپنی منزل سے غافل نہیں ہوتا اسی طرح انسان کو بھی اپنے پیش نظر آخرت کو رکھنا چاہیے اور دنیا میں ایسے وقت گزارے جیسے مسافر۔ حدیث میں ہے کن فی الدنیا کانك غریب اوعابر سبیل۔ چونکہ حاضرین میں ایک بڑی تعداد سالکین طریق کی تھی تو وعظ میں بعض سلوک کی اصطلاحات کا بھی تذکرہ کیا گیا جو ذرا مشکل ہے اگر عام قاری کی سمجھ میں نہ آئے تو پریشان نہ ہو بقیہ مفید مضامین سے مستفید ہو اور اس حصہ کو سالکین کے لیے سمجھے وہ اس سے استفادہ کرلیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

الرحیل الی الخلیل
(سفر آخرت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تکوینیات کے ذکر کا مقصود	۹
۲	آسمان اور زمین کی تخلیق کا مقصد	۱۱
۳	دور حاضر کے طلباء	۱۳
۴	نور ولایت کی بے قدری	۱۴
۵	ولایت کی دو قسمیں	۱۴
۶	علم کا خاصہ	۱۵
۷	جیل میں اہل کمال کا حال	۱۶
۸	شان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۱۷
۹	حسن محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۱۸
۱۰	طلباء کو نصیحت	۱۹
۱۱	لباس معیار لیاقت نہیں	۲۰
۱۲	آج کل قوم کی حالت	۲۲
۱۳	اللہ تعالیٰ کے عاشق صادق بننے کی ضرورت	۲۳
۱۴	ایک عاشق مجازی کی حکایت	۲۴

۱۵..... راضی بہ رضائے الٰہی رہنے کی ضرورت..... ۲۵
۱۶..... کمال عبدیت انسان میں نمایاں ہے..... ۲۶
۱۷..... اخفاء عبادت میں ریا..... ۲۷
۱۸..... خود کو مٹانے کی کوشش کرو..... ۲۷
۱۹..... فنا بغرض شہرت کبر ہے..... ۲۸
۲۰..... تکوین مقصود قرآن نہیں..... ۲۹
۲۱..... چند معقولی حضرات کی حکایات..... ۲۹
۲۲..... معقولیوں کا وہم..... ۳۲
۲۳..... جنم روگ..... ۳۴
۲۴..... کلابی تقویٰ..... ۳۴
۲۵..... ہم ہر وقت سفر آخرت میں ہیں..... ۳۵
۲۶..... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حال..... ۳۶
۲۷..... قرآن کا محاورہ..... ۳۷
۲۸..... خاصہ بشریہ..... ۳۸
۲۹..... اطمینان بالدنیا بڑا مرض ہے..... ۳۹
۳۰..... منتہائے سفر..... ۳۹
۳۱..... علامات سفر..... ۴۰
۳۲..... لوازم سفر..... ۴۱

۳۳.....	سلوک عمل بالشریعت کا نام ہے.....	۴۱
۳۴.....	اسباب سفر.....	۴۲
۳۵.....	مقامات ومنازل سلوک.....	۴۵
۳۶.....	غلطی کا منشاء.....	۴۷
۳۷.....	عارف کو فنائے تام حاصل ہوجاتا ہے.....	۴۹
۳۸.....	تحدث بالنعمت.....	۵۰
۳۹.....	جذب کی حقیقت.....	۵۳
۴۰.....	چشتیہ اور نقشبندیہ کا فرق.....	۵۳
۴۱.....	عشق کی شان.....	۵۶
۴۲.....	صاحب تمکین اور صاحب تلوین.....	۵۷
۴۳.....	کاملین کی مثال.....	۵۸
۴۴.....	جذب وسلوک.....	۵۹
۴۵.....	محبت حق سبحانہ وتعالیٰ کا طریقہ.....	۶۱
۴۶.....	مطالعہ دینی کتب.....	۶۲
۴۷.....	کتب علوم مکاشفہ واسرار کے مطالعہ کا حکم.....	۶۳
۴۸.....	تارک دنیا ہونا بڑا مشکل ہے.....	۶۴
۴۹.....	ایک صاحب تلوین درویش کی حکایت.....	۶۵
۵۰.....	احوال وجدی.....	۶۵

۵۱..... رحمت حق ۶۶
۵۲..... اجتہاد ملائکہ ۶۷
۵۳..... خلاصہ بیان ۶۸
۵۴..... وجود کفر میں حکمت ۶۹
۵۵..... اسماء الٰہی کی قسمیں ۷۰
۵۶..... اخبار الجامعہ ۷۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ و نشھد انّ سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ اٰلہ و اصحابہ و بارك وسلم اما بعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا)(۱)

تکوینیات کے ذکر کا مقصود

مجھے صرف آیت اولیٰ کے متعلق بیان کرنا ہے مگر دوسری آیتیں اس لیے پڑھ دی ہیں تا کہ آیت اولیٰ کی تعیین ہوجائے کیونکہ وہ آیت قرآن میں اور جگہ بھی آتی ہے۔ چنانچہ سورہ مزمل میں بھی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا(۲) اور مجھے اس وقت سورت دہر کی آیت مقصود بالبیان ہے(۳) تو اس کی تعیین کے لیے اگلی آیتوں کی بھی تلاوت کردی۔ رہا یہ کہ جب آیت دونوں جگہ ایک ہی ہے تو تعیین آیت دہر(۴) کی کیا ضرورت ہے۔ سو خیال یہ ہے کہ شاید دہر کی آئندہ آیات کے متعلق بھی کچھ بیان ہوجائے۔ اس لیے تعیین کردی گئی بہرحال یہ ایک ضروری مضمون ہے اس کو غور سے سنئے۔

(۱) ''یہ نصیحت ہے جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرلے اور بدون خدا کے چاہے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے، خدا بڑا علم والا اور بڑا حکمت والا ہے وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے'' سورۃ الدھر: ۲۹۔۳۱ (۲) ''یہ نصیحت ہے جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے'' سورہ مزمل: ۱۹ (۳) بیان کا مقصد سورت دہر کی تفسیر کرنا ہے (۴) سورت دہر کی آیت کو متعین کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ (یہ نصیحت ہے) کہ یہ مضامین یادداشت ہیں (۱)، هذه سے اوپر کے مضامین کی طرف اشارہ ہے۔ اوپر بہت سے مضامین مذکور ہیں جو سب دینی مضامین ہیں اور قرآن میں تو دین ہی کا ذکر ہوگا، تکوین (۲) کا ذکر بھی اگر کہیں ہے تو دین ہی کے لیے ہے۔ محض تکوین من حیث ہو تکوین (۳) مقصود بالذکر نہیں۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو سب امور تکوینیہ کو قرآن میں ٹھونستے ہیں (۴) اور قرآن سے ان کو ثابت کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ اہتمام منکر ہے (۵) کیونکہ یہ قرآن کا مقصود نہیں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن میں تکوین کا ذکر نہیں ہے، ضرور ہے لیکن مقصود بالذات ہو کر نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے: وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَّا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِن فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ۔ (۶) دوسرے مقام پر ارشاد ہے: أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ الى قوله كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ (۷)

(۱) یاد رکھنے کے قابل ہیں (۲) کسی چیز کے پیدا کرنے اور وجود عطا کرنے کا بھی اگر ذکر ہے تو دین ہی کے لیے ہے (۳) کسی چیز کے وجود کا ذکر بحیثیت وجود کہیں نہیں ہے (۴) تکوینی علوم کو قرآن سے ثابت کرنے کی فکر کرتے ہیں (۵) ناپسندیدہ (۶) ''اور وہ زبردست بخشنے والا ہے جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا پھر تو اب کی بار نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ (آخرکار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آوے گی اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بتا دیا ہے اور ہم نے ان شیاطین کے لیے دوزخ کا عذاب بھی تیار کر رکھا ہے'' سورۃ الملک: ۲۔۵ (۷) ''کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور اس کو آراستہ کیا اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور اس میں ہر قسم کی چیزیں اُگائیں جو ذریعہ دانائی اور بینائی ہر رجوع ہونے والے بندوں کے لیے اور پھر آسمان سے برکت والا پانی برسایا پھر اس سے باغ لگائے، کھیتی کا غلہ لمبے کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہوتے ہیں، بندوں کے لیے روزی دینے کے لیے اور ہم نے اس کے ذریعے سے مردوں کو زندہ کیا، اسی طرح زمین سے نکلنا ہوگا سورہ ق: ۶۔۱۱

ان آیات میں آسمان کی پیدائش اور استواری (۱) کا ذکر ہے کہ آسمان میں کچھ شقاق اور فطور (۲) نہیں ہے مگر اس سے مقصود صرف تکوین (۳) کا بیان نہیں ہے بلکہ اس سے اثبات قدرت مقصود ہے (۴) جس سے امکان معاد (۵) پر دلیل قائم کرنا مطلوب ہے۔ اسی غرض کے لیے جابجا (۶) سموات کی پیدائش واستحکام واستواری کا ذکر فرمایا گیا ہے اور سحاب وبرق ورعد (۷) وغیرہ کا ذکر اثبات وجود صانع کے لیے کیا گیا ہے، محض طبعیات کی تحقیق مطلوب نہیں۔ چنانچہ ہر مقام پر سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مقصود اثبات وجود وتوحید صانع ہے (۸) اسی لیے جابجا تکوینیات کا ذکر کرکے ارشاد ہوا ہے کہ ان میں عقلاء کے لیے آیات ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الأرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخِّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ (۹)

آسمان اور زمین کی تخلیق کا مقصد

چنانچہ اس آیت سے اوپر یہ ارشاد ہے: وَإِلَـٰهُكُمْ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَـٰنُ الرَّحِيمُ (۱۰) یہ تو سباق ہے جس میں توحید کا دعویٰ ہے اور اس کے آگے ارشاد ہے:

(۱) اس کی درستی (۲) کوئی شگاف وپھٹن نہیں ہے (۳) وجود (۴) بلکہ مقصد قدرت الٰہی کا اثبات ہے (۵) جو اس بات کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے (۶) جگہ آسمان کی پیدائش اور اس کی مضبوطی ودرستگی کا تذکرہ ہے (۷) بادل بجلی اور کڑک گرج کا ذکر اللہ کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کیا ہے کہ ان چیزوں کو پیدا کرنے والا ہی خدا ہے (۸) تکوینیات کے ذکر میں سیاق وسباق کے اعتبار سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس سے مقصود اللہ کے وجود اور توحید کا اثبات ہے (۹) ’’یعنی بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندروں میں چلتے ہیں، آدمیوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا، پھر اس سے زمین کو تروتازہ کیا، اس کے خشک ہونے کے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلائے اور ہواؤں (سمتیں اور کیفیتیں بدلنے میں) اور ابر (کے وجود) میں جو زمین وآسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے دلائل (توحید کے) موجود ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں اور ان آیات سے توحید صانع کا ثابت کرنا مقصود ہے‘‘ سورۃ البقرہ: ۱۶۴ (۱۰) ’’اور تمہارا معبود صرف ایک اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بہت مہربان نہایت رحم والا ہے‘‘ سورۃ البقرۃ: ۱۶۳

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللهِ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا(۱) یہ سیاق ہے جس میں ابطال شرک ہے(۲) اور اگر کسی کو سیاق وسباق میں تامل کرنا(۳) کافی نہ ہوتو ایک آیت میں خود ساتھ ساتھ ہی اس مضمون کے ذکر کی حکمت کو بیان فرمادیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ(۴) اس میں صاف تعلیم ہے کہ خلق سموات والارض(۵) میں اس غرض سے تفکر کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی حکمت کی قدرت کا علم ہو کہ یہ فضول پیدا نہیں کیے گئے۔ پھر اس سے امکان وقوع معاد(۶) پر استدلال کر کے جنت کی طلب اور جہنم سے استعاذہ(۷) کرنا چاہیے۔ پس ثابت ہوگیا کہ تکوینیات(۸) کا ذکر قرآن میں بطور آیات ودلائل کے ہے اور آیات سے مراد اگر استدلال علی الصانع واثبات معاد(۹) کے سوا کچھ اور لیا جائے تو سیاق وسباق آیات کا اس سے آبی ہے(۱۰) اور اگر سیاق وسباق میں تامل نہ کیا جائے تو بعض آیات میں خود یہی نتیجہ صراحتاً مذکور ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا تو اگر تکوینیات کا ذکر قرآن میں ہے بھی جس کو آج کل سائنس کہا جاتا ہے تو مقصود بالذات ہو کر نہیں بلکہ دین کے تابع ہو کر ہے مجھے تو سائنس کا لفظ بولنے سے بھی شرم آتی ہے۔ گو

(۱) ''یعنی اور ایک آدمی وہ بھی ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک خدائی قرار دیتے ہیں ان سے ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا ضروری ہے اور جو مومن ہیں ان کو ضرور اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے'' سورۃ البقرۃ:۱۶۵ (۲) جس میں شرک کا بطلان بیان کیا (۳) غور کرنا (۴) ''یعنی بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں (توحید کے) دلائل موجود ہیں۔ اہل عقل کے لیے جن کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس مخلوق کو لا یعنی (بیکار) نہیں پیدا کیا ہم آپ کو پاک سمجھتے ہیں۔ سو ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے'' سورۃ آل عمران: ۱۹۰۔۱۹۱ (۵) آسمان وزمین کی پیدائش کا مقصد (۶) آخرت کے واقع ہونے پر (۷) پناہ مانگے (۸) بنانے والے یعنی اللہ کے وجود پر استدلال اور آخرت کے ثبوت کے علاوہ (۹) بنانے والے کے وجود پر استدلال اور آخرت کے اثبات کے علاوہ (۱۰) آیت کا سیاق وسباق اس سے انکار کرتا ہے۔

آج کل ان الفاظ کا استعمال کرنا فخر شمار ہوتا ہے مگر ہم کو اس فخر سے عار آتی ہے۔ بقول ع

آنچہ فخر تست آں ننگ من ست (۱)

دور حاضر کے طلباء

مگر افسوس اب زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ مخاطبین ان الفاظ کے بغیر مطلب ہی سمجھتے نہیں اس لیے بعض دفعہ ہمیں اپنی زبان بگاڑ کر ان الفاظ کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جیسے ایک وکیل انگریز میرٹھ میں ایک دیہاتی سے کہہ رہا تھا کہ مطبل (۲) بھی سمجھ گیا ایسے ہی ہمیں ان الفاظ کو بعض دفعہ مخاطبین کی ضرورت سے بولنا پڑتا ہے مگر ہم ان کو اپنے لیے عار (۳) سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارے سلف کی یہ زبان نہیں تھی مگر افسوس آج کل طلباء تک میں یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ان الفاظ کے استعمال کو فخر سمجھتے ہیں اور قصداً اپنی تقریر کو ان الفاظ سے بھرتے ہیں تا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مقرر کوئی ملا ہے بلکہ نو تعلیم یافتہ طبقہ کے مقرر سمجھے جائیں۔ طلباء آج کل اپنا مولوی ہونا چھپاتے ہیں اور قصداً ان الفاظ کی مشق کرتے ہیں جیسے کانپور میں بعض طالب علموں کو دیکھا کہ بوٹ اور ترکی ٹوپی پہن کر عینک لگا کر بازار میں نکلتے تھے تا کہ لوگ ان کو جنٹلمین سمجھیں مولوی نہ سمجھیں مگر حالت یہ تھی کہ جس طرف سے بھی نکلتے دکاندار پکارتے کہ مولوی صاحب یہاں آیئے۔ میں نے کہا کہ ڈوب مرو کہ تم تو اپنی مولویت کو چھپانا چاہتے ہو مگر وہ چھپ نہیں سکتی۔ صورت کی قدرتی ہیئت کو دیکھ کر لوگ پہچان لیتے ہیں کہ یہ مولوی ہیں۔ اب تم اپنی اس قدرتی ہیئت کو بھی بدلو تو ہم جانیں اور یہ واقعہ ہے کہ طالب علم چاہے کیسا ہی لباس پہن لے اس کی صورت سے طالب علمی ظاہر ہو جاتی ہے خواہ اس کا منشاء نور حق ہو جو علم دین کا خاصہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

نور حق ظاہر بود اندر ولی نیک بیں باشی اگر اہل دلی (۴)

اور ایک اردو کا شعر گویا اسی کا ترجمہ ہے گو مولانا کے شعر کے سامنے اس کے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا مگر مخاطبین کی رعایت سے پڑھتا ہوں کہ وہ اس کو جلدی سمجھ جائیں گے۔

---

(۱) ''جس پر تجھ کو فخر ہے وہ ہمارے لیے باعث شرم و عار ہے'' (۲) یعنی مطلب سمجھ گیا (۳) باعث شرمندگی

(۴) ''اللہ والوں میں حق کا نور ظاہر ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو اچھی نظر سے دیکھ''

مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

نور ولایت کی بے قدری

خواہ آج کل کے محاورہ میں یہ کہو کہ ان کی صورت پر نحوست برستی ہے(۱)۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عربی طلباء کی صورت پر ایسی نحوست ونکبت (۲) برستی ہے کہ وہ ہر جگہ پہچان لیے جاتے ہیں خواہ کسی لباس میں ہوں کیسی ہی حالت میں ہوں۔ افسوس یہ لوگ کیا حقیقت سمجھے اس نور کی۔ اگر اس امتیاز کا منشاء نحوست ونکبت ہے تو یہ نحوست تو ہر مسلمان میں ہے کیونکہ ہر مسلمان کو کافر سے صورت میں امتیاز ہوتا ہے۔ مسلمان چاہے کیسی ہی وضع اختیار کرلے اگر اس کے دل میں ایمان ہے تو ہزار کافروں کے اندر اس کی صورت ممتاز ہوگی۔ چنانچہ اگر کوئی اصلی مسلمان لوگوں سے چندہ وصول کرنے کے واسطے اپنے کو نومسلم ظاہر کرے تو تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ یہ نومسلم نہیں بلکہ اصلی مسلم ہے۔ اگر یہ نحوست ہے تو ڈپٹی صاحب بھی اس نحوست سے خالی نہیں تھے۔ اس پر کوئی یہ کہے کہ اگر طلباء کے اندر یہ امتیاز بوجہ نورانیت کے ہے تو وہ تمہارے نزدیک ولی ہوئے پھر ولی مان کر ان کی مذمت کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس لیے مذمت کرتا ہوں کہ وہ اس نور ولایت کی بے قدری کرتے ہیں اور اس کو مٹانا چاہتے ہیں۔ جیسے کسی شخص کے پاس بڑا قیمتی جوہر ہو اور وہ اس کی قدر نہ کرتا ہو بلکہ اسے ضائع کرنا چاہتا ہو تو ہر شخص اس کو احمق کہے گا۔

ولایت کی دو قسمیں

دوسرے ولایت کی دو قسمیں ہیں ایک ولایت عامہ دوسرے ولایت خاصہ۔ سو طلباء میں ولایت عامہ کا تحقق ہے اور ولایت عامہ کا اجتماع مذمت کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ ولایت عامہ تو ہر مسلمان میں ہے۔ گو وہ کیسا ہی فاسق ہو اور ظاہر ہے کہ مسلم فاسق باوجود اس ولایت کے محل مذمت وزجر بھی ہے (۳)۔ غرض آج کل طلباء اس طبقہ سے یعنی مولویوں کے زمرہ سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پھر دوسرا

(۱) ٹپکتی ہے (۲) مسکینی (۳) باوجود یکہ ایسی ولایت قابل مذمت اور ڈانٹ ڈپٹ کے لائق ہے۔

راستہ موجود ہے۔ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (اور ہم نے ان کو دونوں راستے بتلادیئے) تم کو اگر مولویت سے عار ہے تو دوسرے طبقہ میں چلے جاؤ اور پوری طرح جنٹلمین ہی بن جاؤ، مولویت کے ساتھ جنٹلمینی کو کیوں جمع کرتے ہو۔ اس سے تو دونوں فرقوں میں قدر نہیں ہوتی۔ ایسا شخص دونوں جگہ ذلیل ہوا ہے اور اگر کوئی ایک طبقہ میں کامل طور سے داخل ہو تو کم از کم اس طبقہ میں تو اس کی تعظیم ہوگی اور عالم کی تو اہل دنیا میں بھی تعظیم ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس میں طمع نہ ہو(۱) جو مانع (۲) عظمت ہے جو عالم طمع سے خالی ہو اس کی علماء بھی تعظیم کرتے ہیں اور دنیادار بھی چاہے اس کا کیسا ہی خستہ حال ہو اور اہل دنیا نہ بھی تعظیم کریں تو علماء تو ضرور اس کی وقعت کریں گے۔

علم کا خاصہ

چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس درس میں آئے جو لباس اور صورت سے بہت ہی خستہ حال تھے۔ طلباء نے اس کی طرف التفات بھی نہ کیا یہ سمجھے کہ کوئی معمولی شخص ہے اور یہ علوم غامضہ کا درس (۳) کیا خاک سمجھے گا مگر اثناء درس (۴) میں اس نے ایک سوال کیا تو سب کی آنکھیں کھل گئیں اور طلباء کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوگئی کیونکہ

تامرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبرکہ خالی است شاید کہ پلنگ خفتہ باشد(۵)

واقعی علم ایسی چیز ہے کہ ایک بات میں اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ ہاں تصوف کی قلعی کسی طرح نہیں کھلتی کیونکہ خاموش رہیں تو چپ شاہ کہلائیں، بولنے لگیں اور ڈھنگ کی بات کہیں تو محقق وعارف کہلائیں اور بے ڈھنگی ہانکیں تو صاحب رموز مجذوب سمجھے جائیں مگر علم کی قلعی تو ایک ہی بات میں کھل جاتی ہے یہ چھپ نہیں سکتی۔

علی حزیں شاعر کے پاس ایک شخص آیا۔ لباس سے شان وشوکت ٹپکتی تھی، علی

(۱) لالچ (۲) رکاوٹ (۳) ان گہرے علوم کے سبق کو کیا سمجھ سکے گا (۴) دوران سبق (۵) ''جب تک آدمی گویا نہ ہو اس کا عیب وہنر پوشیدہ رہتا ہے ہر جنگل کو خالی مت سمجھو، ممکن ہے کہ اس میں شیر سویا ہوا ہو''۔

حزیں سمجھا کہ شاید کوئی تعلیم یافتہ مہذب شخص ہے، یہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا، اس کی خاطر سے پاؤں سمیٹ لیے جب بات چیت شروع ہوئی تو علی حزیں نے اس سے نام پوچھا، کہا ایسف (بجائے یوسف) علی حزیں نے یہ سنتے ہی پاؤں پھیلا دیئے اور کہا بابا

اگر تو ایسف ہستی من صائے خود چراکشم

کہ اگر تم ایسف ہو تو میں اپنے پیر کیوں سمیٹوں۔ غرض وہ ایک ہی لفظ سے سمجھ گیا کہ مخاطب محض جاہل ہے اور اسی وقت سے تعظیم قطع (۱) کر دی کیونکہ تعظیم تو کمال کی ہوتی ہے لباس کی تعظیم نہیں ہوا کرتی اور اہل دنیا کی جو تعظیم لباس کی وجہ سے کی جاتی ہے اس کا منشا عظمت نہیں بلکہ خوف ہے جیسے سانپ کو دیکھ کر لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی تھانیدار کو جیل خانہ کی سزا ہو جاتی ہے وہاں جا کر دیکھئے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے۔ چونکہ قانوناً جیل خانہ کے بعد وہ دوبارہ حکومت کے عہدہ پر نہیں جا سکتا اس لیے جیل خانہ والے اس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں تو اگر ان میں سے کسی پر زمان حکومت میں اس نے ظلم کیا ہو تو اب وہ خوب اس سے بدلہ لیتے ہیں، مارتے ہیں، منہ پر تھوکتے ہیں اور بڑی گت بناتے ہیں۔

جیل میں اہل کمال کا حال

میں نے تو ایک مرتبہ جیل خانہ کا معائنہ کیا ہے مجھے تو معائنہ ہی سے بے حد وحشت ہوئی، اللہ سب کو اس سے بچائے۔ البتہ اہل کمال جیل خانہ میں پہنچ کر بھی ایسے ہوتے ہیں جیسے شیر کٹہرے میں بند ہوتا ہے۔ اگر کسی نے جیل خانہ میں جانے سے پہلے ان کی عظمت کی ہوگی وہ اب بھی ان کی عظمت کرے گا ان کے ساتھ اہل دنیا کا سا برتاؤ کوئی نہیں کرتا۔ کٹہرے میں بند شدہ شیر کا قصہ مجھ سے ایک عزیز نے بیان کیا ہے کہ شیر کٹہرے میں بند تھا، ایک شخص لکڑی دکھلا کر اسے دھمکا رہا تھا اور وہ کٹہرے میں ٹہل رہا تھا، ایک دفعہ جو اسے غصہ آیا اور اس نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا اور غرایا، چنگھاڑ ماری تو میاں کھڑے ہی کھڑے گر پڑے، بڑی دیر کے بعد ہوش آیا اور لوگوں کو

(۱) ختم کر دی۔

اس حماقت پر ہنسی آئی کہ یہ خواہ مخواہ ہی ڈرا وہ تو لوہے کی سلاخوں میں بند تھا مگر اس کی وہ ادا ایسی ہیبت ناک تھی جس سے سب مقدمات ذہن سے رخصت ہوگئے۔ عوام کی عادت ہے کہ شیر کے متعلق اس قسم کی بات کو سن کر کہا کرتے ہیں صاحب کیوں نہ ہو آخر شیر ہی جو تھا؟ نہ معلوم اس دلیل کا کیا مطلب ہے اور اس کو شیر کہنا اس کی عظمت و ہیبت کی دلیل کیونکر ہوگئی۔ شاید اس لفظ میں وضعاً کچھ عظمت (۱) پر دلالت ہوگی۔ سو اسی طرح اہل کمال جیل خانہ میں بھی باعظمت ہوتے ہیں۔ شکستہ لباس میں بھی ان کا رعب وجلال ظاہر ہوتا ہے۔

شان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان دیکھئے کہ آپ لباس ہمیشہ موٹا پہنتے تھے اور کمبل اوڑھا کرتے تھے مگر اس کمبل ہی میں رعب وجلال کی یہ حالت تھی کہ سفراء دول (۲) آپ کے سامنے کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی بادشاہ کا سفیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آیا تو صورت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی یہ حالت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت کہ آپ اپنے رعب کو کم کرنا چاہتے تھے، کوئی دنیا کا بادشاہ ہوتا تو اس حالت سے خوش ہوتا کہ مجھے دیکھ کر سفراء دول کانپتے ہیں۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو دین کے بادشاہ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس کی خواہش کیوں کرتے۔ چنانچہ سفیر کی یہ حالت دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو تسلی دی اور فرمایا کہ بھائی مجھ سے کیوں ڈرتے ہو، میں تو ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ یعنی غریب تھی جو گوشت کو سکھا کر دوسرے اوقات کے لیے رکھتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت اپنی تواضع کو ظاہر فرمایا، شاید کوئی کہے کہ گو لباس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سادہ تھا مگر شاید کوئی اور ہیبت رعب کی ہوگی تو سنئے! حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجلس میں اس طرح بیٹھا کرتے تھے کہ نو وارد (۳) کو یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ ان میں سردار کون ہیں اور خادم کون ہیں۔ کوئی صورت امتیاز کی نہ تھی اسی لیے نو وارد کو پوچھنا پڑتا تھا۔ ''من محمد فیکم''

(۱) لفظ شیر کی بناوٹ ہی میں عظمت کے معنی پنہاں ہیں (۲) بادشاہوں کے سفیر (۳) نئے آنے والے کو۔

تم میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون ہیں۔ صحابہ فرماتے: ''ھذا الابیض المتکئی'' یہ گورے چٹے جو سہارا لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ تو نشست و برخاست کی سادگی تھی اور گفتگو کی سادگی یہ تھی کہ دیہات والے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یا محمد ابن عبدالمطلب کہہ کر گفتگو کرتے تھے، صاف نام لیا کرتے تھے، القاب و آداب کچھ نہ استعمال کرتے تھے، اس میں کچھ تو ان کے دیہاتی ہونے کا اثر تھا اور کچھ عرب میں سادگی ہے۔ بھئی سنا ہے کہ اب تک بھی ان کی یہی معاشرت کہ وہ اپنے امراء وسلاطین کو نام لے کر خطاب کرتے ہیں۔ شیوخ عرب شریف مکہ کو یا حسین یا حسین کہہ کر خطاب کرتے ہیں اور آج کل ابن مسعود کے متعلق بھی سنا گیا ہے کہ ان کے بعض آدمی یا ابن مسعود کہہ کر ان سے خطاب کرتے ہیں اور چلنے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ سادگی تھی کہ آپ اکثر صحابہ کے پیچھے چلتے تھے اور کبھی درمیان میں ہوجاتے تھے۔ غرض میمنہ میسرہ اور مقدمہ ساقہ کی کوئی ترتیب نہ تھی (۱) بلکہ کبھی کوئی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگے ہوجاتا کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے ہوجاتے اور کبھی سب سے پیچھے ہوجاتے۔ شاید کوئی کہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسن ایسا تھا جس سے دیکھنے والے پر رعب پڑتا ہوگا کیونکہ حسن کا بھی رعب ہوتا ہے تو سنئے حسن کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اول نظر میں دیکھنے والے کو مغلوب کردے مگر بار بار دیکھنے سے رعب کم ہوجائے، دوسرے وہ جو اول نظر میں مرعوب نہ کرے اور جوں جوں نظر کرتا جائے دل میں کھبتا چلا جائے۔

یزیدك وجهه حسناً اذا مازدته نظراً (۲)

حسن محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسن دوسری قسم کا تھا کہ اول نظر میں مرعوب نہ کرتا تھا، ہاں جتنا زیادہ قریب ہوتا اتنا ہی دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا اور یہ جو حدیث میں آیا ہے۔ ''من راہ بداھة ھابه'' (جو شخص آپ کو بداہۃً دیکھتا اس پر ہیبت طاری ہوجاتی

(۱) دائیں بائیں آگے پیچھے چلنے کی کوئی خاص ترتیب نہیں تھی کہ کون کدھر چلے گا (۲) ''جبکہ اس کو تم جس قدر زیادہ دیکھو گے اس کے چہرہ میں حسن زیادہ نظر آئے گا''

تھی) وہ ہیبت محض حسن کی نہ تھی بلکہ کمالات نبوت کی تھی۔

طلباء کو نصیحت

چنانچہ یہی شان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے اہل اللہ کو عطا ہوتی ہے کہ وہ جیل خانہ میں بھی اور شکستہ حالت میں بھی باعظمت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس شخص نے جس کا اوپر ذکر ہوا تھا کہ شکستہ حالت میں درس میں آبیٹھا تھا جب درس میں سوال کیا اور اس کا کمال ظاہر ہوا تو سب اس کی عظمت کرنے لگے۔ پس میں طلبہ سے کہتا ہوں کہ تمہارا فخر یہی ہے کہ جس جماعت میں تمہارا شمار ہے تم اسی کی اصطلاح اور وضع اور طرز اختیار کرو، تمہاری اسی میں عزت وعظمت ہے اور اگر مخلوق میں اس سے عزت نہ ہوئی تو کیا پروا ہے، خالق کے یہاں تو ضرور عزت ہوگی، پھر تم اپنی وضع کیوں بدلتے ہو۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں:

یامکش بر چہرہ نیل عاشقی　　یا فروشو جامہ تقویٰ بہ نیل(۱)
یا مکن باپیل بانان دوستی　　یا بناکن خانہ بر انداز پیل(۲)

اگر مولویوں میں آئے ہو تو مولویوں کی سی حالت بناؤ۔ اس وضع سے ننگ ونام کا اندیشہ ہو تو اس کا جواب دوسری غزل میں اس طرح دیا ہے۔

گرچہ بد نامیست نزد عاقلاں　　مانمی خواہیم ننگ ونام را(۳)

تم کو ایسی تواضع اور پستی اختیار کرنا چاہیے کہ تمام دنیا پستی وتواضع میں تمہاری شاگرد ہوجائے اور تم اس شعر کے مصداق ہوجاؤ اور بانگ دہل یوں کہو(۴)

افروختن وسوختن وجامہ دریدن　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت(۵)

اسی مضمون کو مولانا اس طرح فرماتے ہیں:

آتش عشق ست کاندرے فتاد　　شورش عشق ست کاندرے فتاد(۶)

---

(۱) ''یا تو نشاں محبت چہرہ پر مت کھینچواؤ یا جامہ تقویٰ کو دریائے نیل کے پانی سے دھوڈالو'' (۲) ''یا تو ہاتھی والوں سے دوستی مت کرو یا گھر کو ہاتھی کے اندازہ کے مطابق بناؤ'' (۳) ''اگرچہ عقل مندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ وناموس کے خواہاں نہیں ہیں'' (۴) خوب کھل کر یوں کہو (۵) ''جلنا بھننا، کپڑے پھاڑنا پروانہ شمع اور گل نے مجھ سے سیکھا ہے'' (۶) ''آتش عشق ہے کہ شراب میں پڑی ہے اور شورش عشق ہے جو بانسری میں واقع ہے''

غرض تم ایسے متواضع ہوجاؤ کہ ہر چیز میں تمہاری ہی تواضع کا اثر ظاہر ہو۔ تم کو ظاہری اسباب عزت کی کچھ ضرورت نہیں، انسان تو وہ ہے جو کمالات میں بادشاہ ہو، گو ظاہر میں فقیر ہو۔ عارف فرماتے ہیں:

مبیں حقیر گدایان عشق را کاین قوم شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند(۱)

اور ایک جگہ اپنی گدائی پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز برفلک و حکم برستارہ کنم(۲)

لباس معیار لیاقت نہیں

لباس اور وضع سے یا اہل دنیا کے طرز گفتگو سے عزت کا طلب کرنا انسان کا کام نہیں اور یہ تو نہایت ہی بھدا پن ہے کہ لباس سے کسی کی قدر و قیمت پر استدلال کیا جائے۔ یہ بات ہمیں شملہ میں پیش آئی ہے جبکہ ہم وہاں وفد بن کر گئے تھے۔ گو آج کل کے وفود میں شرکت کرنا مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ وہ بالآخر وقود(۳) ہوجاتے ہیں مگر وہ وفد دیوبند کے حضرات کا تھا آج کل کے وفود جیسا نہ تھا۔ جب وہاں پہنچے تو مختلف اوقات میں متعدد حضرات کے بیانات ہوئے، جمعہ کے دن میرا بیان ٹھہرا تھا۔ چنانچہ میں جمعہ کی نماز کے بعد بیان کو کھڑا ہوا اس دن غریب مسلمان بھی دوسرے دنوں سے اچھے کپڑے پہنتے تھے اور میں تو زیادہ غریب بھی نہیں۔ الحمد للہ متوسط حالت ہے تو میرے کپڑے اپنے نزدیک خاصے تھے مگر ایک جنٹلمین صاحب کی نظر میں وہ بھی حقیر معلوم ہوئے۔ چنانچہ وہ صاحب ہمارے بیانات کے اعلان کرنے والے سے جو ایک ریاست کے کرنل تھے کہنے لگے کہ آپ کے مولویوں کا کیسا لباس ہے جیسے پائخانہ سے نکل کر آئے ہوں۔ شاید کرنل صاحب نے دانش مندی کا جواب دیا کہ میں ابھی کچھ نہیں کہتا، بیان کے بعد جواب دوں گا۔ چنانچہ بیان ہوا اور وہ معترض بھی بہت محظوظ و حیرت زدہ ہوئے۔ اب کچھ نہیں بولتے مگر کرنل صاحب نے خود پوچھا کہ ہاں اب کہئے آپ کیا فرماتے تھے تو

(۱) وفود جب کسی جگہ جاتے ہیں تو اپنی بات پر جم جاتے ہیں چاہے وہ بات غلط ہی ہو جس کے سبب وہ دوزخ کا ایندھن بن جائیں اس لیے انکو وقود کہدیا جس سے اس آیت کی طرف اشارہ ہے وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ سورۃ البقرۃ: ۲۴ (۲) ''میں گدائے میکدہ ہوں کہ مستی کے وقت دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں''

وہ معترض بڑے چپ ہوئے اور کہا اب کیا کہوں میں اپنی حماقت پر خود شرمندہ ہوں۔ میں تو اب تک لباس سے لیاقت پر استدلال کرتا تھا اب معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط ہے۔ افسوس یہ تو تعلیم یافتہ لوگ اپنی عقل پر اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں جن کے نزدیک لباس معیار لیاقت ہے لباس کو تو معیار لیاقت کوئی احمق بھی نہیں کہہ سکتا مگر وہ شملہ کی چوٹی پر رہ کر بھی جوان لوگوں کی گویا معراج ہے اس حماقت میں مبتلا تھے۔

اس کے بعد میرا بیان پھر ہوا اور اس وقت یہ حکایت میرے کان میں پڑ چکی تھی تو میں نے ان لوگوں کے کان کھولنا چاہے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے بعض خیر خواہان کا یہ خیال ہے کہ علماء کو لباس عمدہ پہننا چاہیے اور غالباً ان کا یہ خیال خیر خواہی اور دلسوزی ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ علماء کی عزت ہو، کسی کی نظر میں ذلت نہ ہو، اس سے ان کے بیان کی بھی وقعت بڑھے گی تو ہم اس خیر خواہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں (میں نے انہی کے محاورات استعمال کیے جیسے میرٹھ میں ایک انگریز وکیل ایک دیہاتی سے کہہ رہا تھا کہ مطبل (۱) بھی سمجھ گیا) مگر دیکھنا یہ ہے کہ علماء قیمتی لباس کہاں سے پہنیں، ان کی آمدنی کی تو حالت یہ ہے کہ کوئی بیس روپیہ کا مدرس ہے کوئی پندرہ روپیہ کا کسی مطبع میں مصحح (۲) ہے اور جس کے اسّی روپے یا سو روپیہ ماہوار ہوں وہ تو مولویوں میں صاحب معراج ہے۔ اب بتلایئے وہ عمدہ عمدہ اور قیمتی لباس جو آپ کی نظر میں بھی عمدہ اور قیمتی ہو کس طرح پہنیں۔ سو اس کے دو ذریعے ہیں جن میں سے ایک تو ہمارے نزدیک بھی اور آپ کے نزدیک بھی حرام ہے۔ گو آپ کے نزدیک عقلاً حرام ہے اور ہمارے نزدیک شرعاً حرام ہے اور ایک صرف ہمارے نزدیک حرام ہے۔ دوسری صورت تو یہ ہے کہ مولوی بھی آپ کی طرح ڈپٹی کلکٹر اور ججی وغیرہ کے منصب حاصل کریں یہ تو ہمارے نزدیک حرام ہے اور پہلی یہ صورت ہے کہ وعظ کے بعد سوال کیا کریں کہ صاحبو! ہمیں جھانسی کے ٹکٹ کی ضرورت ہے یہ سب کے نزدیک حرام ہے ہمارے یہاں نقلاً اور آپ کے یہاں عقلاً تو مولوی تو اس حالت میں عمدہ اور قیمتی لباس بنانے سے معذور ہے۔ ہاں ایک صورت اور ہے وہ یہ کہ جن خیر خواہوں کی یہ

(۱) مطلب (۲) کسی مکتبہ میں تصحیح کا کام کرتا ہے۔

رائے ہے وہ خود یا اپنے چند احباب سے چندہ کر کے ہمارے قیمتی جوڑے اپنی پسند کے موافق بنادیں۔ ہم جب تک شملہ میں رہیں گے ان جوڑوں کو پہن کر وعظ کہا کریں گے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شملہ سے جاتے ہوئے وہ جوڑے آپ کے حوالہ کردیں گے ہم اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے پھر آپ ان جوڑوں کو بہتر یہ ہے کہ یہاں کی انجمن میں وقف کردیں اور جب کوئی مولوی ہمارے جیسا خراب وخستہ لباس والا آوے اس کو وعظ کہنے کے لیے دے دیا کریں کہ تم اس جوڑے کو پہن کر وعظ کہو تا کہ مخاطبین پر اثر ہو۔ بس وہ جوڑے اسی کام کے واسطے رکھے رہیں اس سے آپ کا مقصود بھی حاصل ہوجائے گا اور علماء پر بھی قیمتی کپڑے بنانے کا بار نہ پڑے گا اور چونکہ آپ لوگ علماء سے زیادہ صاحب ثروت ہیں آپ کو یہ کام کچھ گراں بھی نہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ آپ کی ہی پیش کردہ رائے ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہاں سے جا کر تم نے کسی اور جگہ اپنے کپڑوں میں وعظ کہا تو وہاں ذلت ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اور جگہ کے مسلمانوں سے بھی اگر انہوں نے ہمارے لباس کو حقیر سمجھا یہی کہیں گے جو آپ سے کہہ رہے ہیں۔ دوسرے آپ کو دوسروں سے کیا لینا آپ کو تو اپنے یہاں کا انتظام کرنا چاہیے۔ پس اب میں منتظر ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کون کون صاحب ہمارے لیے جوڑے تیار کر کے لاتے ہیں مگر صدائے برنخاست (۱)۔

آج کل قوم کی حالت

بس آج کل قوم کی یہ حالت ہے کہ سارا الزام مولویوں پر رکھتی ہے اور جب ان کے کام کا وقت آتا ہے تو خاموش ہوکر کان دبا لیتے ہیں۔ بلاتشبیہ آج کل مولویوں کی وہ حالت ہورہی ہے جو بھٹیاری کے لڑکے کی حالت تھی۔ حکایت تو فحش ہے مگر مطابق حال ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں پہنچا اور بھٹیاری (۲) کو آٹا دال وغیرہ کھانا پکانے کی غرض سے دیا اور سپاہی خود بھی چولہے کے پاس ہی پلنگ بچھا کر بیٹھ گیا تا کہ بھٹیاری چوری نہ کرسکے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ تو سر ہی پر سوار ہے تو کھانا پکا کر سپاہی

(۱) مگر کسی کی آواز نہ آئی (۲) تندور پر روٹی پکانے والی عورت

کے سامنے رکھا اور اپنے لڑکے سے کہا کہ تُو بھی بیٹھ جا۔ چنانچہ وہ بھی سپاہی کے ساتھ دستر خواں پر بیٹھ کر کھانے لگا اور بھٹیاری نے اس طرح چوری کی مکافات کی ،سپاہی نے دسترخوان پر سے لڑکے کو اٹھانا خلاف شرافت سمجھا، خاموش ہوگیا اور بھٹیاری خوشامد میں پنکھا لے کر جھلنے لگی، اتفاق سے بھٹیاری کی ریح (۱) زور سے صادر ہوئی کہ سپاہی نے بھی آواز سن لی، اس نے شرم اتارنے کو فوراً اپنے لڑکے کے ایک چپت مارا کہ در (یعنی دھر) ہوئے یہ کیا کرتا ہے، سپاہی سمجھ گیا کہ اس نے شرم اتارنے کے لیے لڑکے پر الزام رکھا ہے تو اس نے شرارت کی کہ قصداً زور سے ریح صادر کی اور لڑکے کے لیے ایک دھول رسید کیا اور کہا سسرے کرے گا کوئی مگر پٹے گا تُو ہی، بس وہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ سارا الزام انہی پر ہے آریہ نومسلم کو مرتد کریں تو علماء پر الزام کہ انہوں نے تبلیغ میں کوتاہی کی۔

قادیانی فرقہ مسلمانوں کو کافر بنائے تو مولویوں پر الزام، ترکوں کو جنگ میں شکست ہوتو مولویوں پر الزام اور اگر ان سے کہا جائے کہ بھائی مولوی اپنی جان سے تبلیغ وغیرہ کے لیے موجود ہیں مگر ان کے اہل وعیال کے لیے بھی تو کھانے پینے کا انتظام کیا جائے اور دورہ کے لیے کرایہ کا بندوبست کیا جائے، اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے اس کا سامان تم کروتو اس کا کچھ جواب نہیں، گویا ان کے ذمہ دین کی خدمت بالکل ضروری نہیں، ہاں بس ان کے ذمہ تو یہ ضروری ہے کہ مولویوں کو الزام دیا کریں تو ہم اس میں بھی راضی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے عاشق صادق بننے کی ضرورت

اور میں طلباء سے کہتا ہوں کہ تم کسی کی تحقیر کی پروانہ کرو، اگر کوئی تمہارے طرز میں عیب نکالے، نکالنے دو، تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کافی ہے، تم ان کو راضی کرنے کی فکر کرو اور یاد رکھو کہ عشق میں تو ملامت ہوا ہی کرتی ہے تم خدا تعالیٰ کے عاشق بننا چاہتے ہوتو ملامت سننے کے لیے تیار رہو۔

(۱) ہوا زور سے بآواز بلند نکل گئی۔

نسازد عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوے ملامت(۱)

اور اگر کوئی تم کو نحوست ونکبت سے مطعون کرے یا کوئی دیوانہ کہے تو تم اس کو یہ جواب دو۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم(۲)

عارف شیرازی سلامت کو مٹانے اور ملامت کو گوارا کرنے کے حق میں فرماتے ہیں:

ایں خرقہ کہ من دارم دررہن شراب اولیٰ ویں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ(۳)

من حال دل اے زاہد باخلق نخواہم گفت کایں نغمہ اگر گویم باچنگ ورباب اولیٰ(۴)

ایک بزرگ نے چنگ ورباب کی تفسیر ملامت سے کی ہے کہ ملامت کے وقت میں یہ نغمہ عشق ظاہر کروں گا کیونکہ محبوب کے لیے ملامت اور دھول دھپہ میں بھی لذت ہوتی ہے اور یہ حالت عشاق مجازی تک پر طاری ہوتی ہے وہ بھی اپنے اشعار میں اس ذلت کو ظاہر کرتے ہیں۔

بجرم عشق توام می کشند وغوغائیست تو نیز برسر بام آ گہ خوگش تماشائیست(۵)

جو کلام مؤثر ہو سمجھ لو کہ حال سے نکلا ہے، خواہ عشق حقیقی کا حال ہو یا مجازی کا ہو، حالات دونوں کو قریب قریب ہی پیش آتے ہیں۔

ایک عاشق مجازی کی حکایت

ابن عطاء اسکندریؒ نے ایک عاشق مجازی کی حکایت اسی مضمون پر لکھی ہے کہ لوگوں نے تہمت عشق پر اس کے سو کوڑے مارے تو ننانوے پر اس نے آہ بھی نہ کی، سویں کوڑے پر آہ کی، کسی نے پوچھا کہ ننانوے کوڑے کا تو تحمل کر لیا اور اخیر کے ایک

(۱) ''عشق کے لیے گوشہ سلامتی لائق نہیں اس میں تو رسوائی کے کوچہ کی ملامت بہت اچھی ہے'' (۲) ''ہم اگر قلاش ہیں یا دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے، یہی دولت کیا کم ہے کہ اس ساقی ومحبوب حقیقی اور اس کی شراب محبت سے مست ہیں'' (۳) ''یہ لباس جو کہ میں پہنے ہوئے ہوں، شراب خانہ میں رکھنا بہتر ہے اور میرے دفتر فضولیات کو شراب کے مٹکے میں ڈبونا بہتر ہے'' (۴) ''زاہد اپنے دل کے حال کو دنیا سے کہنا نہیں چاہتا اگر میں اس نغمہ کو گاؤں تو کوچہ ملامت ہی زیادہ بہتر ہے'' (۵) ''تیرے عشق کے جرم میں مجھے کھینچے لیے جاتے ہیں اور بھیڑ لگی ہوئی ہے تو بھی تو کوٹھے پر آ کر دیکھ لے کہ کتنا اچھا تماشا ہو رہا ہے''۔

کوڑے کا تحمل نہ ہوا، اس کی کیا وجہ ہے؟ کہا ننانوے تک تو محبوب میرے سامنے تھے اور وہ کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا کہ میری محبت میں اس کو یہ مصیبت پیش آئی، اس لذت میں مجھے الم ضرب (۱) کا احساس نہ ہوا، ننانوے کے بعد وہ چلا گیا تو مجھے الم (۲) کا احساس ہوا اس لیے آہ نکل گئی۔ تو اے صاحبو! یہ اس کا محبوب تھا جو غائب ہو گیا اور آپ کا محبوب تو ہر دم آپ کے ساتھ ہے، ہر حالت میں آپ کو دیکھ رہا ہے جس کی شان یہ ہے کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (نہ اس کو اونگھ آتی ہے نہ نیند، پھر آپ کو ملامت اغیار میں زیادہ لذت آنا چاہیے)

راضی بہ رضائے الٰہی رہنے کی ضرورت

غرض طلبہ نے یہ نیا طرز سیکھا ہے کہ لباس و گفتگو میں تکلف و تصنع برتنے لگے، ایسے ہی تکلف کے واسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں:

جملہ اوراق و کتب درنار کن سینہ را از نور حق گلزار کن (۳)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنٹلمینوں کی وضع چھوڑ کر بزرگ کی وضع بنانے لگو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے کوئی خاص وضع نہ بناؤ جو محبوب دے وہ پہنو، شال دے شال اوڑھو، کمبل دے کمبل اوڑھو اور ہر حال میں خوش رہو مگر حدود شرعیہ سے باہر نہ جاؤ۔ ایک شادی میں دو شخص جمع تھے جو باہم عزیز تھے مگر ایک نے درویشی اختیار کر لی تھی وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور دوسرے رئیس تھے وہ شال اوڑھے ہوئے تھے اور یہ رشتہ میں بڑے تھے۔ جب دونوں ایک مجلس میں مجتمع ہوئے تو رئیس نے کہا یہ کمبل اتارو کیا خرافات لباس ہے ہمیں برا لگتا ہے، درویش نے شال کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ تم اس کو اتار دو مجھے یہ بری لگتی ہے۔ اس حکایت سے میرا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے کمبل ہی میں خوش تھا، ایسا ہی تم کو ہونا چاہیے کہ خدا تعالیٰ جس حالت میں رکھیں اسی میں خوش رہو اور کسی کی طعن کی پروانہ کرو اور دوسرے وقت اگر اللہ تعالیٰ تم کو شال اوڑھا دیں تو اس

(۱) پٹائی کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا (۲) درد کا (۳) ''تمام ورقوں اور کتابوں کو آگ میں ڈال اور اپنے سینہ کو نور حق سے گلستان بنا''

وقت شال اوڑھ لو، اب کمبل کے پابند نہ ہو کیونکہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص حالت عبادت کی مقرر نہیں کی بلکہ اس کی ہر حالت جو حدود کے اندر ہو عبادت ہے۔

کمال عبدیت انسان میں نمایاں ہے

مارے حاجی صاحب نے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ(۱) کی تقریر میں یہ نکتہ ظاہر فرمایا تھا جس سے اس اشکال کا جواب دیا تھا کہ عبادت تو اشجار واحجار وجبال وسموات وملائکہ سب کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ(۲)

پھر انسان وجن کی تخصیص آیت میں کیوں کی گئی۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور مخلوق کی عبادت مثل مزدور یا نوکر کی خدمت کے ہے جو معین (۳) ہوتی ہے اور انسان کی عبادت غلام کی خدمت کے مثل ہے جس کے لیے کوئی صورت معین نہیں۔ غلام ایک وقت میں آقا کا پاخانہ بھی اٹھاتا ہے اور دوسرے وقت میں آقا کی وردی پہن کر اس کی جگہ جلسوں میں جاتا ہے تو غلامی جو حقیقت ہے عبدیت کی اس کی پوری شان انسان ہی میں نمایاں ہے کہ اس کے لیے کوئی خدمت معین نہیں، ایک وقت میں تاج ''كَرَّمْنَا'' (ہم نے مکرم کیا) اس کے سر پر ہے، طوق (۴) ''فَضَّلْنَا'' (ہم نے فضیلت دی) اس کی گردن میں ہے خلافت الٰہی کی مسند پر بیٹھا ہوا ہے اس وقت تمام عالم اس کا مسخر ہے (۵)۔ چنانچہ روح کی تجلی ہوتی ہے تو تمام عالم اس کے سامنے سربسجود ہوجاتا ہے اور اس وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خدا تعالیٰ کی تجلی ہے چنانچہ اس مقام پر بہت سے پھسل گئے ہیں کہ تجلی روح کو تجلی الٰہی سمجھ کر برسوں اس کی عبادت کرتے رہے اور ایک وقت میں حضرت انسان پاخانہ میں تشریف فرما ہوتے ہیں اس وقت اس کا ہگنا موتنا بھی عبادت میں داخل ہے، یہ بات کسی مخلوق کو حاصل نہیں، یہ حضرت انسان ہی ہیں جو ہر حالت میں عابد ہیں، سوتے ہوئے بھی، روتے ہوئے بھی،

(۱) ''اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں'' سورۃ الذّاریات: ۵۶''
(۲) ''کیا نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں'' (۳) مقرر ومقرین (۴) فضلنا کا ہار (۵) تابع۔

ہنستے ہوئے بھی، ہگتے ہوئے بھی۔ پس میں علماء کو کہتا ہوں کہ تم اپنی حالت کو سرکاری وردی سمجھو نہ ذلت کی پروا کرو، نہ عزت کی غرض، مخلوق پر نظر ہی نہ کرو، سب سے نظر ہٹالو۔

اخفاء عبادت میں ریا

عام صوفیہ کا مشہور قول ہے کہ اظہار عبادت مخلوق پر ریا ہے اور محققین حضرات کا ارشاد ہے کہ اخفاء عبادت خلق سے ریا ہے کیونکہ مخلوق پر نظر ہی کیوں گئی جو اس سے اخفاء کا اہتمام کیا۔ اگر تم مخلوق کو ایسا سمجھتے جیسی مسجد کی صفیں تو ان سے اخفاء نہ کرتے۔ کوئی مسجد کی صفوں سے بھی اخفاء کا اہتمام کیا کرتا ہے بس تم مخلوق کو کالعدم اور لاشئے(۱) محض سمجھو کسی پر نظر نہ کرو، صرف ایک ذات پر نظر رکھو۔

دلارامے کہ داری دل در و بند دگر چشم از ہم عالم فروبند(۲)

یہی تو وحدۃ الوجود ہے(۳) جو کسی کی زبان سے کسی طرح نکل گیا وہ کافر کہلائے گا کیونکہ اس نے زبان عشق میں اس کو ظاہر کیا اور عاشق کی زبان کافی نہیں ہوتی۔ توضیح مراد کے لیے عاقل کی زبان کافی ہوتی ہے چنانچہ محققین اسی وحدۃ الوجود کو زبان عقل سے ظاہر کرتے ہیں ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگا سکتا مگر جن پر فتویٰ لگایا گیا ہے ان کو اس کی بھی پروا نہیں وہ اپنے کلام میں تاویل بھی نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایمان وکفر مخلوق کے ہاتھ میں نہیں ہے اور تاویل وہ کرے جو مخلوق پر کچھ بھی نظر کرتا ہو اور جس کی نظر مخلوق پر بالکل نہ ہو اس کو اس کی بھی ضرورت نہیں۔

خود کو مٹانے کی کوشش کرو

پھر جس کی نظر مخلوق سے اس قدر اٹھی ہوئی ہو اور جس کا یہ مذاق ہو کہ اخفاء اطاعت خلق سے بھی ریا ہے(۴) وہ بھلا بڑا بننے کی تو کوشش کیوں کرے گا کیونکہ بڑا بننے میں تو اپنے اوپر بھی نظر ہوتی ہے اور مخلوق پر بھی، اور فانی کی نظر کسی پر نہیں ہے اور میں تو

(۱) بالکل معدوم سمجھو (۲) ''جس دل آرام، یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو'' (۳) وجود حقیقی وذاتی صرف اللہ تعالیٰ کا ہے (۴) مخلوق سے چھپا کر عبادت کرنا یہ بھی ایک قسم کا ریاء ہے۔

یہ کہتا ہوں کہ بڑا بننے کی تدبیر بھی یہ نہیں ہے جو متکبرین نے اختیار کی ہے کہ بڑا بننے کا سامان کرتے ہیں بلکہ اس کی تدبیر بھی یہی ہے کہ اپنے کو مٹادو۔ افسوس بعض شعراء نے اس کو سمجھ لیا اور آج کل علماء نے بھی اس کو نہ سمجھا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزت شو کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا(۱)

عنقا نے اپنے کو مٹادیا تو اس کا نام اس قدر مشہور ہوا کہ مخلوق کی زبان زد ہے۔ اسی طرح تم اپنے کو مٹادو، گمنام کردو، سب سے الگ ہوجاؤ تو پھر تمہاری محبوبیت کی شان یہ ہوگی کہ تم چپ ہوگے تو لوگ تمہارے بولنے کے شیدا ہوں گے۔ حجرہ میں بیٹھوگے تو مخلوق تمہارے خروج کی متمنی ہوگی اور یوں کہے گی۔

بنائے رخ کہ خلقے والہ شوندو حیراں بکشائے لب کہ فریاد از مردوزن برآید(۲)

مگر اس نیت سے اپنے کو نہ مٹانا کیونکہ اس نیت کے ساتھ تم مٹنے ہی کے نہیں اس حالت میں ڈلے پتھر کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

فنا بغرض شہرت کبر ہے

فناء بغرض شہرت کبر ہے اسی طرح تفویض (۳) بغرض راحت تجویز ہے۔ بعض لوگ اس غرض سے تفویض کرتے ہیں کہ اس میں راحت بہت ہے تم اس کا قصد کر کے تارک تفویض نہ بنو بلکہ فنا کا اس لیے قصد کرو کہ تم واقع میں فنا ہی کے مستحق ہو۔

وجودك ذنب لا يقاس به ذنب(۴)

اور تفویض اس نیت سے کرو کہ یہ محبوب کا حق ہے کہ سب کام اسی کے سپرد کردیا جاوے۔

سپردم بتو مایہ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را(۵)

اگر کہو یہ بڑی دور کی بات ہے تو میں کہتا ہوں کہ دنیوی مقاصد کون سے قریب

(۱) ''یعنی اگر تم کو شہرت کی تمنا ہے تو گوشہ تنہائی کے دام میں اسیر ہوجاؤ کیونکہ گوشہ گیری کی وجہ سے عنقا تمام دنیا میں مشہور ہوگیا'' (۲) ''مخلوق کو چہرہ انور دکھلا دیجئے کہ وہ دیدار کے لیے بے تاب وحیران ہیں۔ لب مبارک کھولئے کہ تمام مردوزن آپ کا کلام سننے کی التجا کررہے ہیں'' (۳) سپردگی (۴) ''تیرا وجود ہی گناہ ہے کسی گناہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا'' (۵) ''میں نے اپنا سرمایہ تیرے حوالے کردیا حساب کی کمی بیشی کو تو ہی جانے''۔

ہیں، وہ بھی تو دور ہی ہیں، کھانا کھاتے ہو، بتلاؤ وہ کتنی دور سے حاصل ہوتا ہے، کسی نے بویا، کسی نے کاٹا، کسی نے پیسا، پھر گوندھا اور توے پر ڈالا اور کھانے بیٹھے، پھر بھی اول لقمہ سے سیری نہیں ہوتی بلکہ لقمہ اخیر سے شبع (۱) ہوتا ہے۔ بتلاؤ کتنی لمبی مسافت ہے۔ اسی طرح پانی پیتے ہو تو جرعہ اخیر (۲) سے سیرابی ہوتی ہے وہ بھی تو دور ہی ہے اور تفویض تو اس سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ حضرت بایزیدؒ نے خواب میں حق تعالیٰ سے پوچھا ''دلنی علی اقرب الطرق الیك'' کہ مجھے اپنے پاس پہنچنے کا نزدیک تر راستہ بتلادیجئے۔ ارشاد ہوا'' دع نفسك وتعالیٰ'' کہ اپنے آپ کو چھوڑ دو اور آجاؤ، بتلایئے اس میں کون سا بعد ہے اپنے کو چھوڑ دو بس وہ قریب ہے۔

میان عاشق ومعشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز (۳)

تکوین مقصود قرآن نہیں

یہ مضمون تو بہت طویل ہے، گھنٹوں میں بھی ختم نہ ہوگا۔ اب میں مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلباء کو تکلف وتصنع سے احتراز کرنا چاہیے۔ اسی کے ضمن میں یہ بات بیان کی تھی کہ طلباء آج کل انگریزی الفاظ کے استعمال کو فخر سمجھتے ہیں یہ بہت برا ہے اور یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے تکوین کا ترجمہ تفہیم مخاطبین کے لیے سائنس سے کیا تھا، غرض تکوین مقصود قرآن نہیں ہے بلکہ اصل مقصود دین کا بیان ہے، تکوین کا ذکر بھی قرآن میں دین ہی کے لیے ہے مقصوداً نہیں ہے۔

چند معقولی حضرات کی حکایات

تو اس آیت سے اوپر جس کی میں نے تلاوت کی ہے کچھ مضامین دینیہ مذکور ہیں۔ حق تعالیٰ ان کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلاً (اب جس کا جی چاہے اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرلے) یہاں فمن شاء (اب جس کا جی چاہے) سے تخییر مطلوب نہیں بلکہ ترغیب وتحریض مقصود ہے (۴)۔ یہ میں

(۱) آخری لقمہ سے پیٹ بھرتا ہے (۲) آخری گھونٹ (۳) ''محبوب اور محبت کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے اے حافظ تو اس حجاب خودی کو درمیان سے اتار پھینک'' (۴) اختیار دینا مقصود نہیں بلکہ فعل پر ابھارنا مقصود ہے

نے اس لیے کہہ دیا تا کہ کوئی معقولی اس کو تخییر (۱) پر محمول نہ کرے کیونکہ جن پر معقول کا غلبہ ہوتا ہے ان کو ذوق لسان نہیں رہتا تو معقولی صاحب تو یہاں فَمَنْ شَآءَ دیکھ کر یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ اختیار دے رہے ہیں کہ جس کا جی چاہے راستہ اختیار کرے اور ایسے واقعات بدفہمی کے معقولیوں سے وقوع میں آچکے ہیں۔ چنانچہ ایک معقولی طالب علم حضرت مولانا گنگوہی کے یہاں درس حدیث میں شریک تھے مگر حدیث النفس میں بھی مشغول تھے۔ جب ترمذی کی اول حدیث آئی: لَا یُقْبَلُ اللّٰہُ صَلٰوۃً بِغَیْرِ طَھُوْرٍ (۲) اور اس سے اشتراط وضو پر استدلال کیا گیا تو معقولی صاحب بولے کہ اس سے شرط صحت ہونا تو معلوم نہ ہوا صرف شرط قبول ہونا معلوم ہوا جو اس طرح بھی متحقق ہوسکتا ہے کہ نماز کی صحت تو بدون وضو کے بھی ہوجائے گی مگر مقبول نہ ہو، پھر بعد نماز کے وضو کرلے جس سے اب نماز قبول ہوجائے۔ بس اس کا جواب بدون اس کے اور کیا ہے کہ معقول کی وجہ سے ان کا ذوق لسان مسخ ہوگیا جس کو ذرا بھی زبان کا ذوق ہوگا وہ لَا یُقْبَلُ اللّٰہُ صَلٰوۃً بِغَیْرِ طَھُوْرٍ (۳) سے تقدم طہور (۴) کی ضرورت کو معاً سمجھ لے گا۔ اسی طرح حضرت مولانا گنگوہی کے پاس ایک شخص آیا اور مسئلہ پوچھا کہ آدھا چوہا کٹ کر کنویں میں گر پڑا، کتنے ڈول نکالے جائیں تو ایک معقولی صاحب جلدی سے بولے کہ تیرہ ڈول نکال دو۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ تو احمق ہے سارا پانی نکال دو، کنواں ناپاک ہوگیا، بعد میں معقولی صاحب نے حضرت سے پوچھا پورا چوہا گر پڑے اور مرجائے تو بیس سے تیس ڈول تک کا حکم ہے اور آدھا چوہا گرنے پر آپ نے سارا پانی نکالنا واجب کردیا، اس کی کیا دلیل ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے تیرہ ڈول کس دلیل سے بتلائے، کہا میں نے بیس اور تیس کا اوسط پچیس نکال لیا تھا، پھر جب پورا چوہا گرتا تو پچیس ڈول ہوتے، اب آدھا گرا ہے تو پچیس کا آدھا ساڑھے بارہ ہوتے تھے، میں نے کسر کو پورا کرکے تیرہ ڈول بتلادیئے اور پورا نکالنا واجب ہوتو "الکل اعظم من الجزء" (۵) کے خلاف لازم آتا

(۱) اس سے اختیار نہ سمجھے (۲) "اللہ تعالیٰ بغیر پاکی کے کوئی نماز قبول نہیں کرتے" سنن النسائی: ۱/۸۷، سنن الدارمی: ۱/۱۷۵ (۳) "اللہ تعالیٰ بغیر پاکی کے کوئی نماز قبول نہیں فرماتے" (۴) اس عبارت سے فوراً سمجھ لے گا کہ عبادت سے قبل طہارت حاصل کرنا ضروری ہے (۵) کل جزء سے بڑا ہوتا ہے۔

ہے اور اپنی حماقت سے یہ نہ سمجھا کہ کٹ کر گرا ہے تو کنوئیں میں دم مسفوح(۱) گرا اور دم مسفوح کا ایک قطرہ بھی سارے کنویں کو ناپاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر معقولی صاحب کو اس کا ہوش ہوتا تو سمجھتے کہ واقعی میرا حساب غلط تھا۔ ایک واقعہ معقولی کے ساتھ خود مجھے پیش آیا ہے، میں کانپور میں حدیث پڑھا رہا تھا ایک معقولی صاحب بھی درس میں آبیٹھے تھے۔

یہ حدیث آئی ''من انتهى الى غير ابويه لم يرح ريح الجنة''(۲) جو شخص اپنے خاندان کو چھوڑ کر دوسرے خاندان کی طرف اپنی نسبت کرے گا وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا۔ آج کل شہروں میں یہ مرض بہت شائع ہوگیا ہے شہر میں جا کر جولاہے بھی سید ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ کابل سے ایک جولاہا ہندوسان آیا اور یہاں آکر پٹھان بن گیا، کچھ دنوں کے بعد ایک پٹھان آیا، اس نے جو دیکھا کہ جولاہے نے اپنے کو پٹھان بنا رکھا ہے تو وہ سید بن گئے، اس کے بعد ایک سید صاحب آئے، انہوں نے دیکھا کہ یہاں پٹھان نے اپنے کو سید بنا رکھا ہے تو آپ نے یہ کہنا شروع کیا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں (نعوذ باللہ منہ) لوگوں نے اس پر ہنسنا شروع کیا تو سید نے کہا کہ جس ملک میں جولاہا پٹھان اور پٹھان سید بن جاتا ہے وہاں سید اگر خدا کا بیٹا بن جائے تو کیا تعجب ہے اس نے سب کی قلعی کھول دی تو میں نے اس حدیث کی شرح میں کہا کہ یہ بہت سخت وعید ہے کہ ایسے شخص کو جنت کی خوشبو بھی نہ آئے گی تو جنت میں کیا جاتا تو معقولی صاحب بولے کہ اس سے دخول جنت کی نفی تو لازم نہیں آتی، ممکن ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوکر بھی خوشبو نہ سونگھے، میں نے کہا یہ کیونکر کہنے لگے اس طرح کہ وہ مزکوم ہوجائے(۳) میں نے کہا سبحان اللہ جنت میں بھی زکام ہوا تو جنت کیا ہوئی۔ غرض یہ معقولی محض الفاظ کے چکر میں رہتے ہیں اور امکانات بعیدہ ہی نکالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک معقولی صاحب ایک تیلی کی دکان پر تیل لینے گئے، وہاں دیکھا کہ بیل کی گردن میں گھنٹی پڑی ہوئی ہے، پوچھا بھائی اس گھنٹی میں کیا حکمت ہے، تیلی نے کہا کہ ہم لوگ غریب آدمی ہیں، سارے کام

(۱) بہتا ہوا خون (۲) مجمع الزوائد للہیثمی: ۹/ ۳۰۱، بلفظ آخیر (۳) اس کو زکام ہوجائے جس کی وجہ سے ناک بند ہوجائے۔

اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں، ہر وقت بیل کے ساتھ نہیں رہ سکتے، یہ گھنٹی اس کے گلے میں اس لیے ڈال دی ہے تا کہ اس کے بجنے سے معلوم ہوتا رہے کہ بیل چل رہا ہے، اگر گھنٹی بند ہوتی ہے تو ہم آ کر بیل کو پھر چلا دیتے ہیں اور چلا کر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ معقولی صاحب بولے کہ گھنٹی کا بجنا بیل کے چلنے کی دلیل تو نہیں ہوسکتی، ممکن ہے کہ وہ کھڑا کھڑا سر ہلاتا رہا، تیلی نے کہا مولوی صاحب میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی، آپ جلدی یہاں سے تشریف لے جایئے، کہیں وہ منطق نہ سیکھ لے، پھر ہماری تو مصیبت آجائے گی۔

معقولیوں کا وہم

یہ غلو فی المعقول (۱) کا نتیجہ ہے کہ ان کو مشاہدات وواقعات میں بھی توہمات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر کمال یہ کہ محض توہمات ہی پر ورق کے ورق سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک مسئلہ ان کے یہاں مشہور ہے کہ قضیہ موجبہ میں وجود موضوع شرط ہے نہ معلوم اس دعوے کی دلیل کیا ہے۔ محض توہم ہے اور کچھ بھی نہیں مگر اس مسئلہ کو مان کر پھر جو اشکالات وارد کرنے اور ان کے جواب دینے شروع کیے ہیں تو بڑی لمبی بحث ہوگئی ہے۔ اللہ بھلا کرے حمد اللہ کا اس نے اس کو رد کیا ہے اور کہا کہ قضیہ موجبہ کے لیے وجود موضوع کی ضرورت نہیں صرف ربط موضوع بالمحمول کافی ہے اور بہت سے مسائل معقولیہ اسی شان کے ہیں تو میں نے ایسے ہی معقولیوں کا وہم رفع کرنے کے لیے کہا ہے کہ یہاں تخییر پر رد نہیں اور اگر فَمَنْ شَآءَ (اب جس کا جی چاہے) سے تخییر ہی مراد ہوا کرے تو ایک مقام پر ارشاد ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (اب جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے) کیا اس کو بھی تخییر پر محمول کیا جائے گا ہرگز نہیں بلکہ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلاً (پس جو چاہے اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرلے) میں ترغیب وتسہیل مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ مضامین تذکرہ ہیں جن سے خدا کا راستہ آسان ہوگیا ہے اس لیے ہم اعلان عام کرتے ہیں کہ جس کا دل چاہے خدا کے راستہ پر چلے، اب کچھ دشواری نہیں، یہ تو آیت کی تفسیر تھی۔ اس

(۱) علوم عقلیہ میں غلو کرنے کا نتیجہ ہے۔

سے میرا مقصود یہ ہے کہ اس آیت میں گو ''ان ھذہٖ'' کا مشار الیہ ظاہراً صرف سورہ دہر کے مضامین ہیں لیکن یہ شان تمام ہی قرآن کی ہے کیونکہ قرآن میں جا بجا قرآن کو تذکرہ اور ذکرا ور ذکری کہا گیا ہے جس سے خاص مضامین پر اشارہ نہیں ہے بلکہ سارے قرآن کے مضامین پر اشارہ ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ (یعنی اس میں خیر خواہی ہے اس شخص کے لیے جس کے پاس قلب سلیم ہے) اور یہاں یقیناً ذٰلِکَ سے پورا قرآن مراد ہے اور سوہ عبس میں ہے کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ (۱) یہاں تو یقیناً ''اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ'' سے تمام قرآن ہی مراد ہے تو حاصل اس جملہ کا یہ ہوا کہ قرآن (بلکہ تمام شریعت کیونکہ قرآن ساری شریعت کی اصل ہے باقی سب اس کی شرح ہے۔ اسی واسطے بعض حدیث میں قرآن سے مراد مطلق شریعت بھی وارد ہے۔ چنانچہ ''اِقۡضِ بَیۡنَنَا بِکِتَابِ اللّٰہِ'' (۲) کہنے پر فیصلہ فرمایا گیا جو کہ قرآن میں نہیں ہے۔ غرض قرآن پاک بلکہ سب دین) تذکرہ ہے اور یادداشت ہے کس چیز کی؟ سبیل رب کی کیونکہ آگے اختیار سبیل رب کو اسی صفت تذکرہ پر مرتب کیا گیا ہے، رب سبیل سمجھئے۔ سبیل کہتے ہیں لغت میں راستہ کو اور راستے کی دو قسمیں ہیں ایک لمبا راستہ جس کو سفر کہتے ہیں اور ایک مختصر اور قصیر (۳) راستہ۔ اب غور کیجئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قصیر ہے یا طویل؟ ظاہر ہے کہ طویل ہے۔ یہ راستہ قصیر تو ان کے نزدیک ہوگا جو عید بقر کے نمازی ہوں ورنہ یہ تو ساری عمر کا قصہ ہے کسی دن بھی اس کے طے کرنے سے بس نہیں کر سکتے۔ اگر ہزار سال کی بھی عمر ہو جب بھی نماز فرض رہے گی، روزہ فرض رہے گا، زکوٰۃ فرض رہے گی، غرض کسی وقت فرائض سے سبکدوشی نہیں ہوسکتی، گویا عمر بھر اسی راستہ کو طے کرتے ہیں۔

(۱) ''ہرگز ایسا نہ کیجئے قرآن نصیحت کی چیز ہے سو جس کا دل چاہے اس کو قبول کرلے وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں، رفیع المکان ہیں، مقدس ہیں جو ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے کہ وہ مکرم اور نیک ہیں'' سورۂ عبس: ۱۱۔۱۶ (۲) ''ہمارے لیے کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجئے'' فتح الباری: ۱۳ / ۲۸۸ (۳) چھوٹا راستہ

جنم روگ

جیسے ہمارے حضرت حافظ ضامن صاحبؒ نے اس شخص سے پوچھا تھا کہ آپ کا لڑکا کیا پڑھتا ہے، کہا قرآن حفظ کرتا ہے، فرمایا ارے اس بیچارے کو کیوں جنم روگ لگایا۔ حافظ صاحب میں مزاح بہت تھا، اس لیے گفتگو کے عنوان ایسے ہی ہوا کرتے تھے مگر حقیقت اس کی یہ تھی کہ حفظ قرآن ایک دن کا کام نہیں، عمر بھر کا کام ہے، ساری عمر اسی میں لگا رہے تب تو محفوظ رہتا ہے ورنہ بہت جلد حفظ سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ رجب کا مہینہ آتے ہی حفاظ کو قرآن یاد کرنے کی فکر ہوگی، دور شروع ہوجائے گا۔ پانی پت میں ایک رئیس ہیں وہ سبعہ قراءات کے حافظ ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر سال ایک قاری کی روایت میں تراویح سناتے ہیں مگر کیا مجال کہ دوسری قرأت اس میں اختلاط ہوجائے۔ اگر قالون کی روایت شروع کریں گے تو اخیر تک قالون ہی کی روایت رہے گی ورش کی روایت کا اس میں خلط نہ ہوگا، بڑا اچھا حافظ ہے مگر یہ اس کی بدولت ہے کہ ہر سال رجب سے جو وہ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں پھر کسی کام کو نہیں دیکھتے۔

کلابی تقویٰ

اسی طرح ساری شریعت ہے کہ یہ عمر بھر کا کام ہے ایک دو دن کا کام نہیں، نوافل ومستحبات کو تو آدمی ترک کرسکتا ہے مگر فرائض وواجبات اور تلاوت قرآن کی پابندی کرنے سے کچھ نام بھی نہیں ہوتا، مستحبات ونوافل کی پابندی میں نام اور امتیاز زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان دنیا وظائف کو ناغہ نہیں کرتے مگر نماز قرآن کو ناغہ کرتے رہتے ہیں، فرائض وواجبات کو ضائع کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کو نام مقصود ہے راستہ کا طے کرنا مقصود نہیں ورنہ اہم واقدم کا زیادہ(۱) اہتمام کرتے۔ (میرٹھ میں ایک رشوت خوار تھے وہ وظیفہ کے تو اتنے پابند تھے کہ اشراق تک وظیفہ پڑھتے اور درمیان میں کسی سے بات نہیں کرتے مگر اسی وقت میں اشارات سے رشوت کا معاملہ بھی طے ہوتا

(۱) جو کام اہم اور مقدم ہو اس کو پہلے کرتے

رہتا تھا۔ مقدمہ والا اشارہ سے ایک کہتا یہ انگلی کے اشارہ سے دو کہتے پھر اشارات ہی میں معاملہ طے ہوجاتا۔ سو یہ تقویٰ کلابی کہلاتا(۱) ہے کہ وظیفہ میں بات کرنے سے تو اتنا پرہیز اور رشوت سے پرہیز نہیں، کتے کی بھی یہی حالت ہے کہ ٹانگ کی تو اتنی احتیاط کرتا ہے کہ اس کو اٹھا کر موتتا ہے(۲) تاکہ پیشاب کی چھینٹ نہ پڑ جائے اور منہ کو گوہ میں بھی ڈال دیتا ہے جیسے ایک تیلن سے کسی نے پوچھا کہ تیرا میاں کہاں ہے وہ چونکہ نئی نئی دلہن تھی جس کے لیے منہ سے بولنا عیب ہے اس نے زبان سے تو کچھ جواب نہ دیا مگر لہنگا اٹھا کر پیشاب کیا اور پیشاب کے اوپر کو پھاند گئی(۳)، مطلب یہ تھا کہ دریا پار گیا ہے۔ یہی حالت اہل دنیا کے وظائف کی ہے۔

ہم ہر وقت سفر آخرت میں ہیں

بہرحال خدا کا راستہ قصیر نہیں بلکہ طویل ہے کہ عمر دراز میں بھی طے نہیں ہوسکتا مگر جن کو توفیق دی گئی ہے ان کے لیے قصیر ہوجاتا ہے۔ گو واقع میں طویل ہے جیسے قیامت کے بارے میں ارشاد ہے: فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (کہ وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا) مگر حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو اتنا چھوٹا معلوم ہوگا جیسے ایک نماز کے شروع سے اس کے ختم کرنے تک فاصلہ ہوتا ہے اور اوپر جو حضرت بایزیدؒ کے قصہ میں طریق دین کا قصیر ہونا بیان کیا گیا ہے مراد اس قصر سے سہولت ہے بمقابلہ مشاق دنیا کے۔ اب سمجھئے اور اسی بات کا سمجھانا اس بیان سے مقصود ہے کہ جب خدا کا راستہ طویل ہے اور ہم اس پر چل رہے ہیں تو ہم ہر وقت سفر میں ہوئے اور قرآن اس سفر کی یادداشت ہے جو اس راستہ سے منازل ومقامات سے ہم کو آگاہ کرتا ہے۔ جب ہم سفر میں ہوئے تو بتلایئے کیا سفر میں بھی چین ہوا کرتا ہے۔ مگر افسوس ہم کیسے بے فکر ومطمئن ہیں۔ گویا وطن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اے صاحب جس کو ہر وقت سفر درپیش ہو وہ کیونکر مطمئن ہوکر بیٹھ سکتا ہے اور جس کے سامنے اتنا لمبا سفر ہو وہ کیونکر دل کھول کے ہنس سکتا ہے۔

(۱) کتے کے تقویٰ کی مانند ہے (۲) پیشاب کرنا ہے (۳) پیشاب کے اوپر سے کود گئی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال

اسی لیے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اسی باب میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔ ''کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان'' (۱) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ فکر وسوچ میں اور رنج وغم میں رہتے تھے اور اس فکر وغم ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کھل کر ہنستے نہ تھے۔ حدیث میں ہے: ''کان جل ضحکہ التبسم'' کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بڑا ہنسنا یہ ہوا کہ تبسم فرما لیتے تھے اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا حوصلہ تھا کہ ہماری خاطر سے تبسم بھی فرما لیتے تھے ورنہ جس کے سامنے وہ احوال شدیدہ ہوں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر منکشف تھے (۲) اس کو تو تبسم بھی نہیں ہوسکتا۔ شاید کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا خوف تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تو سب ذنوب (۳) کے بخش دیئے جانے کا وعدہ ہو چکا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ بس آپ کے نزدیک جہنم ہی تو ایک خوف کا سبب ہے۔ صاحب اس سے بڑھ کر عظمت حق کا انکشاف خوف (۴) کا سبب ہے جس پر عظمت حق کا انکشاف ہوگیا ہے وہ جہنم کو تو تصور میں بھی نہیں لاتا، پھر اس سے آگے ایک اور مقام ہے جس میں باوجود مغفرت ذنوب (۵) کے بھی جہنم سے اطمینان نہیں۔ ''وھو انکشاف قدرۃ الحق'' (وہ قدرت حق کا منکشف ہونا ہے) اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''لو علمتم ما اعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً'' (۶) یعنی اگر تم وہ باتیں جانتے جو مجھے معلوم ہیں تو بہت کم ہنستے اور زیادہ رویا کرتے۔ اس جگہ کم ہنسنے کے معنی یہ ہیں کہ بالکل نہ ہنستے مگر یہ محاورہ ایسا ہے جیسا اردو میں آپ کہا کرتے ہیں کہ میں ایسا روگ (۷) کم پالتا ہوں یعنی نہیں پالتا اور محاورات اکثر تمام زبانوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ بھی یہ استعمال آیا ہے جہاں قلت کے معنی ہو ہی نہیں سکتے، عدم ہی کے معنی ہوسکتے ہیں۔ یعنی ''فَقَلِیْلاً مَّا یُؤْمِنُوْنَ (سو وہ ایمان نہیں لاتے ہیں)۔

(۱) اتحاف السادۃ المتقی: ۷/۱۵۸ (۲) کھلے ہوئے تھے (۳) سب گناہوں کی معافی کا وعدہ ہو چکا تھا (۴) اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا علم ہوجانا بھی بہت بڑا خوف کا سبب ہے (۵) گناہوں کی معافی کے باوجود (۶) ''مسند احمد ۵: ۳۷۳، تفسیر ابن کثیر: ۸/۲۹۵ (۷) بیماری۔

قرآن کا محاورہ

اس جگہ عام واعظوں کی ایک غلطی یاد آئی وہ یہ کہ قرآن مجید میں ہے : فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (۱) واعظین اس کو امر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم واجب کو ترک کرتے ہو۔ قرآن میں تو کثرت بکاء کا امر ہے (۲) اور تم بالکل نہیں روتے۔ مگر یہ ان واعظین کی غلطی ہے یہاں معنی امر (۳) مراد نہیں بلکہ امر بمعنی خبر ہے (۴) جس میں کفار کی سزا اور عذاب کا ذکر ہے جس کی دلیل سیاق وسباق ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے: وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۵) اور اس کے بعد ارشاد ہے: جَزَاۗءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے) اور درمیان میں ہے فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (پس چاہیے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ بکاء سزا ہے اور ظاہر ہے کہ سزا وہ چیز ہوسکتی ہے جو سزا پانے والے کے اختیار میں نہ ہو بلکہ سزا دینے والے کے اختیار میں ہو اور اگر یہاں معنی انشاء مراد ہوں گے تو ضحک وبکاء مخاطب کے اختیار میں ہوگا اور وہ جزاء نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ یہاں معنی انشاء مراد نہیں بلکہ خبر دینا مقصود ہے کہ ان مشرکین کی سزا یہ ہے کہ وہ تھوڑے دنوں میں ہنس کھیل لیں اور اس کے بعد زیادہ روئیں گے اپنے اعمال کی سزا میں اور خبر کو انشاء کی صورت میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسا کہ ہمارے محاورہ میں بھی کہا کرتے ہیں کہ اب سر پکڑ کر روؤ تمہاری یہی سزا ہے۔ یعنی اب روؤ گے اور اپنے کئے سزا بھگتو گے۔ پس اسی طرح قرآن کا یہ محاورہ ہے جس سے معنی امر مقصود نہیں اور اگر بفرض محال امر ہی مقصود ہوتا تو سیاق وسباق کی وجہ سے مخاطب کفار ہی ہوتے، مسلمانوں کو پھر بھی خطاب نہ ہوتا اس لیے واعظین کا اس سے مسلمانوں کے لیے کثرت بکاء کا مامور بہ (۶) ہونا ثابت کرنا غلط

(۱) ''پس چاہیے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں'' سورۃ التوبہ: ۸۲ (۲) زیادہ رونے کا حکم ہے (۳) یہاں وجوبی معنی مراد نہیں (۴) یہ حکم خبر کے معنی میں ہے کہ کفار کی سزا کی خبر دی ہے (۵) ''اور کہنے لگے کہ تم گرمی میں مت نکلو، آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے، کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے'' (۳) زیادہ رونے کے حکم کا اثبات درست نہیں

ہے۔ یہ بیچ میں استطراداً (۱) ایک فائدہ تفسیر یہ بیان کر دیا گیا۔

خاصہ بشریہ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر جو امور عظام (۲) واحوال شدیدہ تھے ان کے ہوتے ہوئے کسی کو ہنسنے کی تاب نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوصلہ تھا کہ آپ اس کے باوجود بھی تبسم فرما لیتے تھے اس پر اگر یہ سوال ہو کہ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبسم بھی کیوں فرماتے تھے اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ ہماری خاطر سے تاکہ لوگوں کا کلیجہ نہ پھٹ جائے اور وہ یوں نہ کہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت غمگین رہتے ہیں تو ہمارا تو پھر کہاں ٹھکانا ہے، لوگ اس سے مایوس ہو جاتے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ (۳) تبسم فرما لیا کرتے۔ دوسرے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ضحک وتبسم (۴) خاصہ بشریہ ہے کہ ہنسی کی بات پر ہنسی آ ہی جاتی ہے چاہے اندر سے دل پر کیسا ہی غم کا پہاڑ ہو مشہور ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے کیونکہ خاصہ بشریہ ہے تو صاحبو! جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی حالت تھی کہ آپ ہمیشہ فکر مند اور اندوہگیں (۵) رہتے تھے تو ہم آخر کس بات پر بے فکر ہیں اور ہم دنیا سے خوش اور مطمئن کیونکر ہو گئے حالانکہ یہ بے فکری بہت سخت حالت ہے۔ حق تعالیٰ ایک مقام پر کفار کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (کہ وہ دنیا سے خوش اور مطمئن ہو گئے) اس سے معلوم ہوا کہ رضا بالدنیا (۶) مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اس وقت مذموم ہے جبکہ اس کے ساتھ بے فکری بھی ہو ورنہ وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (اور اس سے مطمئن ہو گئے) نہ بڑھایا جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ مذمت میں اس اطمینان کو بھی دخل ہے۔ گویا اطمینان بالدنیا کفر سے کم ہی ہے (۷) مگر ایسا کم ہے۔ جیسا آسمان عرش سے کم ہے مگر فی نفسہ تو بہت بڑا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود (۸)

---

(۱) ضمناً (۲) بڑے بڑے کام (۳) کبھی کبھی (۴) ہنسنا اور مسکرانا انسانی تقاضا ہے (۵) غمگین (۶) دنیا پر خوش ہونا (۷) دنیا پر مطمئن رہنا اگرچہ کفر سے کم ہے (۸) ''آسمان عرش کے مقابلہ میں بیشک نیچا ہے لیکن مٹی کے ٹیلے سے تو کہیں اونچا ہے''

اطمینان بالدنیا بڑا مرض ہے

اسی طرح اطمینان بالدنیا بہت سخت چیز ہے جبھی تو اس کو کفار کی مذمت میں بیان کیا گیا۔ گو کفر سے کم ہو اس جگہ جملہ معترضہ کے طور پر ایک تحقیق لغت کی بھی بیان کردوں کہ آسمان لفظ مفرد نہیں ہے بلکہ مرکب ہے آس اور مان سے، آس بمعنی ''آسیا'' چکی کو کہتے ہیں اور مان بمعنی مانند ہے تو یہ لفظ اصل میں آسیا مان تھا۔ کثرت استعمال سے تخفیف کر کے آسیا کو آس بنالیا گیا، آسمان ہوگیا۔ گو ہمیں فارسی دانی کا دعویٰ نہیں مگر جو لوگ اس کے مدعی ہیں وہ اس نئی تحقیق کو سن لیں۔ غالباً ان کے بھی خیال میں یہ بات نہ آئی ہوگی۔ پس آسمان کو آسمان اس لیے کہتے ہیں کہ ان اہل لغت کے نزدیک چکی کی طرح اس میں بھی حرکت دوریہ ہے۔ غرض رضا بالدنیا واطمینان بہاء (دنیا سے خوش ہونا اور اس سے مطمئن ہونا) گو بمقابلہ کفر کے کم ہے مگر فی نفسہ (۱) بہت بڑا مرض ہے اس کا علاج کرنا چاہیے جس کی ایک صورت یہ ہے جو اس وقت بیان کررہا ہوں کہ انسان یہ تصور پیش نظر رکھے کہ میں ہر وقت سفر میں ہوں۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت سے بطور دلالت التزام کے یہ بات ثابت ہے کہ انسان سفر میں ہے اور اس کے لوازم سے ہے (۲) بے چینی اور عدم اطمینان کیونکہ مسافر کو منزل پر پہنچنے سے پہلے اطمینان نہیں ہوا کرتا بلکہ مسافر کے لیے غیر منزل کے ساتھ تو اطمینان اور رضا خود موانع سفر (۳) سے ہے جو مسافر غیر منزل (۴) سے دل لگالے گا اور اسی میں قیام کر کے بے فکر ہوجائے گا یقینا منزل پر نہ پہنچ سکے گا۔ ان سب باتوں کو بھی قرآن نے بتلادیا ہے کہ دنیا سے رضا اور اطمینان نہ ہونا چاہیے۔ پس قرآن سے بدلالت مطابقی ہمارا مسافر ہونا بھی ثابت ہے اور بدلالت التزامی سفر کے لوازم بھی ثابت ہیں اور اس کے موانع بھی بتلادیئے گئے ہیں۔

منتہائے سفر

اب اس مضمون میں کیا شبہ ہے اور سنئے لوازم سفر سے طریق کا مبدأ و منتہا (۵)

(۱) اپنی ذات کے اعتبار سے (۲) سفر میں بے چینی ہوتی ہی ہے (۳) غیر منزل پر مطمئن ہونا اور اس سے دل لگانا منزل پر پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے (۴) منزل کے علاوہ سے دل لگائے گا منزل پر نہیں پہنچ سکتا (۵) سفر کے لوازمات سے راستہ کی ابتداء وانتہاء بھی ہے۔

بھی ہے سو مبداء(۱) کے بیان کی تو اس لیے ضرورت نہیں کہ وہ تو چلنے والے کے سامنے ہے اور منتہا(۲) کا ذکر قرآن میں جا بجا آیا ہے۔ چنانچہ بار بار فرماتے ہیں: وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۳) اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (۴) وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (۵) اور ایک مقام پر صاف ارشاد ہے: وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْھَا جَآئِرٌ (۶) وَلَوْ شَآءَ لَھَدٰکُمْ اَجْمَعِیْنَ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم سب کو سیدھے راستہ کی طرف جبراً) ہدایت کر دیتے (مگر چونکہ یہ دارالابتلاء ہے اس لیے نہیں کیا جاتا) لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۷) مشہور تفسیر تو یہ ہے: وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْھَا جَآئِرٌ (۸) مگر اس میں مضاف کا حذف ہے جو بلا ضرورت خلاف اصل ہے اس لیے میرے نزدیک یہاں ''علی بمعنی الی'' ہے جو قرآن میں جا بجا آیا ہے۔ چنانچہ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا بمعنی بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا (۹) آیا ہے اور بھی اس کی نظائر تلاش سے ملیں گی۔ اس صورت میں حذف کی ضرورت نہ ہوگی تو منتہائے سفر بھی قرآن میں مذکور ہے۔

علامات سفر

پھر لوازم سفر سے علامات بھی ہیں، ہر راستہ کی کچھ علامات ہوتی ہیں تو یہاں بھی کچھ علامات ہونا چاہئیں بلکہ یہاں ضرورت زیادہ ہے کیونکہ یہ سبیل محسوس نہیں (۱۰) بلکہ معنوی ہے سو قرآن میں اس راستہ کی علامات بھی مذکور ہیں۔ فرماتے ہیں: وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (۱۱) شعائر اللہ وہی علامات ہیں جو خدا کی طرف چلنے کی دلیل ہیں یعنی نماز و روزہ اور حج اور تمام عبادات یہ سب اس راستہ کی علامات ہیں جن پر کسی کو چلتا ہوا دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف چل رہا ہے۔

---

(۱) آغاز (۲) انتہاء (۳) ''اللہ کی طرف امور لوٹتے ہیں'' سورۃ البقرہ: ۲۱۰ (۴) ''تیرے رب کی ہی طرف لوٹنا ہے'' سورۃ العلق: ۲ (۵) ''اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے'' سورہ ال عمران: ۲۸ (۶) ''کہ سیدھا راستہ ہی خدا تک پہنچتا ہے اور بعض ٹیڑھے راستے بھی ہیں اور سیدھے راستہ کی توفیق تو اس کو ہوتی ہے جو طالب حق ہو'' سورۃ النحل: ۹ (۷) ''دین میں جبر نہیں ہے تحقیق ظاہر ہوگئی رشد گمراہی سے'' (۸) ''سیدھا راستہ ان میں بعض ٹیڑھے بھی ہیں'' (۹) ''اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے'' (۱۰) یہ راستہ محسوس نہیں (۱۱) ''اور جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے'' سورۃ الحج: ۳۲۔

لوازم سفر

پھر لوازم سفر سے ضیاء (روشنی) بھی ہے کیونکہ راستہ میں تاریکی ہو تو چلنا دشوار ہے۔ سیر فی الطریق (راستہ میں چلنا) رویت طریق (راستہ دیکھنے) پر موقوف ہے اور رویت بدون ضیاء(۱) کے نہیں ہوسکتی تو قرآن میں اس راستہ کے لیے ضیاء (۲) بھی ثابت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۳) اس میں لفظ بصائر سے ضیاء پر دلالت ہے۔ ایک دفعہ مجھے اس آیت میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ اس جگہ تین چیزیں کیوں بیان کی گئیں۔ ''بصائر وهدى ورحمة'' (بصیرت، ہدایت اور رحمت) پھر سمجھ میں آیا کہ راستہ چلنے میں ایک تو رہبر کی ضرورت ہے وہ تو ''هدى'' ہے پھر رہبر کی عنایت وشفقت کی ضرورت کہ مختصر اور سہل راستہ سے لے جائے وہ ''رحمت'' ہے پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ چلنے والا سوانکھا ہو (۴) اگر راستہ حسی ہے تو بصر کی ضرورت ہے اور معنوی ہے تو بصیرت کی ضرورت ہے اس کا ذکر ''بصائر'' میں ہے مگر بصائر سے مراد اسباب بصیرت ہیں یعنی ضیاء کیونکہ قرآن کو جو بصیرت فرمایا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسباب بصیرت میں سے ہے۔ پس قرآن میں ضیاء معنوی موجود ہے جس میں تامل کرنے سے بصیرت کام کرنے لگتی ہے اور اس کو راستہ نظر آنے لگتا ہے۔ پس اس آیت سے ضیاء بھی ثابت ہوئی اور دوسری آیات میں تو صاف طور پر لفظ نور وارد ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۵) غرض قرآن سے سفر اور لوازم سفر سب ثابت ہیں۔

سلوک عمل بالشریعت کا نام ہے

پھر حضرات صوفیہ کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو ان سے زیادہ

(۱) بغیر روشنی (۲) روشنی (۳) ''یعنی یہ قرآن عام لوگوں کے لیے دانشمندی کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لیے بڑی رحمت ہے'' سورۃ الاعراف: ۲۰۳ (۴) بینائی رکھتا ہو (۵) ''یعنی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی اور ایک کتاب واضح، کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں'' سورۃ المائدۃ: ۱۵۔۱۶

کوئی نہیں سمجھتا۔ ان کے کلام میں یہ حقیقت نمایاں طور پر مذکور ہے۔ چنانچہ انہوں نے عمل بالشریعۃ(۱) کا نام سلوک رکھا ہے جو سفر کے معنی میں ہے اور شریعت پر چلنے والے کو سالک کہتے ہیں اور اعمال کا نام مقامات رکھا جو منازل کے معنی میں ہے۔ شاید کوئی کہے کہ تم کو صوفیہ سے محبت ہے اس لیے خوش اعتقادی کی وجہ سے یوں سمجھ لیا کہ صوفیہ نے قرآن سے اس مضمون کو سمجھ کر یہ نام رکھے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں بہت اچھا اگر انہوں نے قصداً قرآن سے سمجھ کر یہ نام نہیں رکھے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی طبیعت میں سلامتی ایسی تھی کہ ان کی زبان سے وہی بات نکلی جو خدا تعالیٰ نے قرآن میں بتلائی ہے مگر جب صوفیاء کے کلام میں مضمون جابجا پوری صراحت سے مذکور ہے تو ہم کیوں نہ کہیں کہ انہوں نے حقیقت کو قرآن سے سمجھ کر یہ نام رکھے ہیں۔ چنانچہ عارف فرماتے ہیں:

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہردم جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا(۲)

اسباب سفر

اس میں تو صاف سفر کے معنی پر دلالت ہے کہ مجھ کو محبوب کا راستہ طے کرنے میں کسی منزل پر چین کیونکر آئے جبکہ ہر مقام پر جرس(۳) یہ کہتا ہے کہ اسباب باندھو اور آگے چلو، جرس سے مراد شیوخ کا ارشاد ہے کہ وہ کسی مقام پر توقف کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ہر مقام سے آگے بڑھنے کی تاکید کرتے ہیں۔

اے برادر بے نہایت در گہے است ہرچہ بروے میرسی بروے مایست(۴)

گو بعض دفعہ توقف کی بھی اجازت ہے جس کی حقیقتاً گے بیان کروں گا اگر یاد رہا اور خدا کرے یاد رہے یا شوق قلب مراد ہے کہ کسی مقام پر شوقاً سکون نہیں کیونکہ منزل مقصود اس سے بھی آگے ہے، شوق کو سکون تو وصال تام کے بعد ہوگا جو جنت میں حاصل ہوگا اور یہاں تو ہر منزل پر وصال ناقص ہے۔ گو پہلی منزل کے اعتبار سے کامل ہے، غرض شوق کو یا ارشاد شیوخ کو جرس سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ لشکر کے کوچ کے

(۱) شریعت پر عمل کرنے کا نام (۲) ''منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو'' (۳) گھنٹی یہ پیغام دیتی ہے کہ سامان باندھو (۴) ''اے بھائی اس میدان کی کوئی انتہاء ہے ہے جس منزل پر پہنچو گے اس سے آگے منزل ہے''

وقت پہلے گھنٹی بجا کرتی تھی اب بھی اسٹیشن پر بجا کرتی ہے اور آج کل لشکر کے کوچ کے وقت بگل بجایا جاتا ہے مگر طبعاً جرس سے بہ نسبت بگل کے ایک گونہ الفت (۱) سی معلوم ہوتی ہے۔ شاید کوئی کہے کہ یہ مولویت کا غلبہ ہے۔ سو الحمدللہ تم نے فضیلت کا خود اقرار کرلیا۔ والفضل ما شهدت به الاعداء (بزرگی وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں) ہم تو اس پر خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ہم کو پرانی چیزوں سے الفت ہے جن سے سلف کو الفت تھی اور نئی چیزوں سے وحشت ہے۔ چنانچہ چراغ کی روشنی سے مجھے زیادہ فرحت ہوتی ہے۔ خصوصاً شمع کی روشنی تو بہت ہی دلفریب ہے اور برقی (۲) روشنی سے تو نگاہ کو خیرگی دل کو تیرگی ہوتی ہے۔ یہ محض قافیہ نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ غرض عارف نے اس جگہ سلوک کو بالکل سفر کی شکل میں بیان فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

کس ندانست کہ منزل گہ آں یار کجاست ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید (۳)

یہاں بھی اس کو سفر کی صورت میں بیان فرماتے ہیں منزل کہ سفر ہی کے مناسب ہے اور جرس کا سفر کے مناسب ہونا پہلے معلوم ہو چکا۔ بعض لوگوں نے جرس سے بنا بر غلو شغل انحد (۴) کی صورت مراد لی ہے جو کبھی بشکل جرس مسموع ہوتی ہے (۵) اور اس کو ملکوتی (۶) آواز سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے کیونکہ شغل انحد کی آواز کوئی غیبی آواز نہیں بلکہ محض ہوا متموج فی الصماخ (۷) کی صورت ہے۔ کان کے پردہ میں جو ہوا ہے جب کان بند کرلیے جاتے ہیں تو اس میں تموج (۸) پیدا ہو کر قسم قسم کی آوازیں پیدا ہوجاتی ہیں اور یہ شغل سلف میں نہ تھا بلکہ صوفیاء نے ہندوستان کے اہل ریاضت سے اس کو لیا ہے۔ اس شغل کو یکسوئی پیدا کرنے میں بہت اچھا دخل ہے اور طریق میں یکسوئی کی حاجت ہوتی ہے اس لیے متاخرین نے یہ شغل اختیار کرلیا ہے اس لیے حافظ کے کلام میں جرس (۹) سے یہ صورت مراد ہرگز نہیں اس وقت یہ معروف نہ تھا

(۱) طبعی مناسبت (۲) بجلی کی روشنی (۳) ''کسی شخص نے نہ جانا کہ محبوب کا ٹھکانہ کہاں ہے بس اتنا ہی ہے کوچ کے گھنٹہ کی آواز ہوتی ہے'' (۴) مراقبہ انحد مراد لیا (۵) گھنٹی کی طرح سنائی دیتی ہے (۶) فرشتے کی (۷) کان کے سوراخ میں جو ہوا گردش کرتی ہے اس کی آواز ہے (۸) حرکت پیدا ہو کر (۹) گھنٹی۔

بلکہ مراد وہی شوق قلب ہے(۱) یا ارشاد شیوخ (۲) مطلب یہ ہے کہ
کسی کو محبوب کا اصلی مقام معلوم نہیں بس اتنی بات ہے کہ شوق یوں کہتا رہتا ہے کہ اور آگے چلو اور آگے چلو یا شیوخ ہر مقام پر یوں فرماتے ہیں کہ محبوب آگے ہے بڑھے چلو۔ اس میں بھی سفر کے معنی ظاہر ہیں اور مولانا فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید

کہ گو عالم میں کوئی رخنہ (۳) نہیں معلوم ہوتا جس سے منزل محبوب کا پتہ لگے بلکہ راستے سب بند نظر آتے ہیں مگر تم کو یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے تم دوڑنا شروع کرو راستہ خود بخود نکلتا چلا آئے گا۔ اس کی نظیر ایسی ہے جیسے کسی سڑک پر دو طرفہ درخت کثرت سے ہوں تو دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے، دونوں طرف کے درخت ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناواقف یوں کہتا ہے کہ آگے راستہ نہیں مگر محقق کہتا ہے کہ تم چلے چلو راستہ ہے۔ یہ درخت دور ہی سے ملے جلے نظر آتے ہیں تم آگے چلو راستہ خود بخود نکلتا آئے گا۔ اب اگر یہ ناواقف مقلد ہے تو یوں کہے گا:

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزاء دل افگندیم بسم اللہ مجریہا ومرسہا(۴)

اور اگر غیر مقلد ہے تو اپنی نظر قاصر پر اعتماد کر کے رک جائے گا اور مقصود سے رہ جائے گا مگر یہ اس کی حماقت ہے وہ محقق کے قول پر کیوں نہیں چلتا جو یوں کہتا ہے:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید(۵)

اگر وہ یہ کہے صاحب مجھے تو آگے درخت ملے ہوئے نظر آرہے ہیں اگر دوڑوں گا تو اندیشہ ہے کہ درختوں سے ٹکرا کر سر پھوٹ جائے گا تو میں کہتا ہوں پھر کیا مضائقہ ہے۔ محبوب کے راستہ میں ایک سر کیا ہزار سر بھی پھوٹ جائیں تو تھوڑے ہیں اور اگر جان بھی جاتی رہے تو عین سعادت ہے۔ ایک طالب سے شیخ نے اس کی ناکامی کی

(۱) دلی شوق (۲) یا شیخ کا فرمان (۳) کوئی علامت (۴) ''اس دریائے ناپیدہ کنار اور طلاطم اٹھانے والے طوفان میں کشتی دل ہم نے ڈال دی ہے اب اللہ ہی کے نام پر ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا'' (۵) ''اگرچہ عالم میں رخنہ نظر نہیں آتا لیکن یوسف کی طرح دوڑنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے''۔

شکایت پر تنگ ہوکر فرمایا تھا کہ پھر میں کیا کروں؟ جا اپنا سر پھوڑ لے اس نے سچ مچ اپنا سر پھوڑ لیا۔ عاشق کی یہی شان ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ عاشق نواز ہیں فوراً شیخ پر بذریعہ الہام کے عتاب فرمایا کہ کیا حرکت ہے! تم ہمارے طالبوں کے سر پھوڑواتے ہو۔ پس اب تو سر پھوٹنے کا بھی خوف نہ کرو جب وہ دوسروں سے بھی سر پھوڑوانا گوارا نہیں کرتے تو خود تمہارا سر کیوں پھوڑیں گے تم دوڑنا تو شروع کرو ان شاء اللہ راستہ کھلتا چلا جائے گا۔ بہرحال مولانا نے بھی اسی شعر میں سلوک کو سفر ہی بتلایا ہے۔

مقامات ومنازل سلوک

عارف شرازی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

تُو دستگیر شوائے خضر بے خجستہ کہ من پیادہ می روم وہمراہاں سوار انند(۱)

مرشد سے کہتے ہیں کہ آپ دستگیری کیجئے کیونکہ میں تو مقامات ومنازل کو پیادہ طے کررہا ہوں اور ہمراہی سوار ہوکر طے کررہے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ میں پیچھے نہ رہ جاؤں۔ اس میں بھی بالکل سفر ہی کا نقشہ بیان فرمایا ہے۔ سوار اور پیادہ سفر ہی کے لوازم سے ہیں تو صوفیاء کے کلام سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ انسان ہر وقت سفر میں ہے کسی وقت اس کو توقف نہیں، روزانہ کسی مقام کو طے کرنے میں مشغول ہے مگر مقامات سے مراد اعمال باطنیہ ہیں یعنی خوف ورجا محبت وانس، توکل ورضا، شکر وصبر تواضع وغیرہ اور لاہوت (۲) وملکوت (۳) وناسوت (۴) یہ مقامات سلوک نہیں ہیں اور بعضوں نے ایک اور قافیہ نکالا ہے ہاہوت، نہ معلوم یہ لغت بھی ہے یا نہیں۔ بہت سے ان کو مقامات سلوک سمجھتے ہیں۔ یہ غلط ہے بلکہ مراتب موجود ہیں ان کو اختیار سے کون طے کرتا ہے کوئی نہیں، ہاہوت (۵) درجہ ذات حق ہے اگر یہ لغت صحیح ہو اور لاہوت اجمال صفات ہے (۶) اور جبروت (۷) مرتبہ تفصیل صفات ہے اور ملکوت (۸) عالم ملائکہ ہے اور ناسوت عالم انسان

(۱) ''اے خضر راہ تو ہی میرا ہاتھ پکڑ کہ میں پیدل ہوں میرے ہمراہی سوار ہیں'' (۲) مرتبہ صفات اجمالیہ کو لاہوت کہتے ہیں (۳) اعیان ثابتہ اور حقیقت آدم اور عالم ارواح ومثال کو ملکوت کہتے ہیں (۴) عالم اجسام کو ناسوت کہتے ہیں (۵) مرتبہ ذات حق کو ہاہوت کہتے ہیں (۶) صفات اجمالیہ کو لاہوت کہتے ہیں (۷) صفات تفصیلیہ کو جبروت کہتے ہیں (۸) ملکوت عالم ملائکہ اور ناسوت عالم انسان ہے۔

ہے تو ہاہوت ولاہوت وجبروت کا طے کرنا تو انسان سے محال ہے، ذات وصفات حق کے مراتب کو کون طے کرسکتا ہے کہ امکان کا انقلاب وجوب کی طرف لازم آتا ہے اور ناسوت کے طے کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس میں تو آپ موجود ہی ہیں اور ملکوت میں پہنچنا ممکن تو ہے مگر اختیاری نہیں، بعد موت کے خود بخود ہر شخص وہاں پہنچ جائے گا۔ حتی کہ کافر بھی پہنچ جائے گا جہاں اس کی مارکوٹ ہوگی وہ تو ملکوت سے پناہ مانگے گا تو یہ مقامات سلوک نہیں ہیں (۱) بلکہ مقامات سلوک وہی اعمال باطنیہ ہیں جن کی تحصیل کا شریعت نے امر کیا ہے (۲) اور ہر مسلمان خصوصا سالک ہمیشہ ان کے طے کرنے میں مشغول ہے کسی وقت توقف نہیں ہوتا، یہ دنیا کا سفر نہیں کہ ایک حد پر ختم ہوجائے بلکہ اس سفر کی کہیں انتہا نہیں۔ ہر دن جو عمل آپ کرتے ہیں اس سے نیا راستہ طے ہوتا ہے آج جو آپ نے نماز پڑھی ہے اس سے بھی کچھ راستہ طے ہوا ہے اور اس کے بعد جو نماز پڑھو گے اس سے بھی راستہ طے ہوگا اور جتنی دفعہ ذکر اللہ کرتے ہو ہر دفعہ میں کچھ راستہ طے ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح روزانہ ہر ساعت میں آپ اس راستہ کو قطع کر رہے ہیں۔ ہاں ان مقامات میں بعض دفعہ کچھ توقف بھی ہوتا ہے جیسا کہ میں نے اوپر کہا تھا اب میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ سو سمجھ لیجئے کہ اس طریق میں ایسا توقف تو کبھی نہیں ہوتا جیسا سفر دنیا میں اسٹیشن یا منزل پر سفر دنیا میں ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے سیر بالکل

(۱) اس کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ مصنوعات صانع کا ظہور ہوتا ہے ورنہ کیسے پتہ لگے پھر صانع میں ایک مرتبہ ذات کا ہے ایک صفات کا پھر صفات میں ایک مرتبہ اجمال کا ایک تفصیل کا، ذات کا علم صفات سے اور اجمال کا تفصیل سے ہوتا ہے۔ مخلوقات سے اللہ کے وجود کا علم ہوا اللہ تعالیٰ کی صفات تفصیلیہ سے صفات اجمالیہ کا اور پھر ان سے ذات کا علم ہوا۔ مخلوقات میں ایک عالم ارواح ہے ایک عالم اجسام ان میں سے ایک لطیف ہے ایک کثیف ان میں تعلق کے لیے ایک ایسی چیز پیدا کی جس کو دونوں سے تعلق ہے اس کو عالم مثال کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ظہور کے چھ مرتبے ہیں دو مرتبے ظہور کے صفات اور چار مخلوقات میں ہیں ان چھ ظہوروں کو تنزلات ستہ کہتے ہیں۔ مرتبہ وجود ذات حق کو ہاہوت کہتے ہیں مرتبہ صفات اجمالیہ کو لاہوت، صفات تفصیلیہ کو جبروت، اعیان ثابتہ اور حقیقت آدم اور عالم ارواح ومثال کو ملکوت اور عالم اجسام کو ناسوت اور عالم انسان کو مرتبہ جامعہ کہتے ہیں۔ یہ سب اصطلاحی الفاظ ہیں۔ ملخصا شریعت وطریقت ص: ۳۳۴ (۱۲ خلیل)

(۲) حکم دیا ہے۔

منقطع ہوجاتی ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ یہاں ہر دم سیر ہی سیر ہے کبھی سیری (۱) نہیں ہوتی۔ البتہ بعض دفعہ اگلے مقامات کے اعتبار سے کسی مقام پر ظنا توقف (۲) معلوم ہوتا ہے کہ سالک اپنے کو متوقف سمجھنے لگتا ہے حالانکہ واقع میں وہ سائر ہے (۳) اور اس کی نظیر سفر دنیا میں امریکہ کا ایک واقعہ سنا گیا ہے۔ ایک دوست نے بیان کیا ہے کہ امریکہ میں اسٹیشن پر ریل ٹھہرتی نہیں کیونکہ اس توقف کو وہ لوگ اضاعت (۴) وقت سمجھتے ہیں کہ خوامخواہ ہر اسٹیشن پر ۱۵ منٹ یا آدھ گھنٹہ ضائع ہوتا ہے وہاں یہ صورت ہے کہ ہر اسٹیشن پر ایک لکڑی کا اسٹیشن متحرک بنا ہوا ہے اس میں پھٹے بھی لگے ہوئے ہیں جب ریل کے آنے کا وقت ہوتا ہے سب لوگ اس لکڑی کے اسٹیشن پر آجاتے ہیں اور جس وقت ریل آتی ہے یہ لکڑی کا اسٹیشن کسی حلقہ کے ذریعے سے ریل کے ساتھ مرتبط ہوجاتا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی جدا لائن پر چلتا رہتا ہے۔ جب مسافر سوار ہوجاتے ہیں اس وقت ریل کے حلقہ سے اس کا حلقہ الگ کردیا جاتا ہے ریل آگے چلی جاتی ہے اور یہ اسٹیشن پیچھے رہ جاتا ہے پھر اسٹیشن کے ملازم اس کو بدستور اپنی جگہ پر لے آتے ہیں تو جس وقت ریل سامنے سے آتی ہے اور یہ لکڑی کا اسٹیشن اس کے ساتھ مرتبط (۵) ہوتا ہے ریل کے بیٹھنے والے اس وقت یہ سمجھتے ہیں کہ ریل ٹھہر گئی جیسا کہ یہاں جب دو ریلیں ایک رفتار سے ایک سمت کو ساتھ ساتھ چلتی ہیں تو ہر ایک کے مسافر یہ سمجھتے ہیں کہ گاڑی ٹھہری ہوئی ہے حالانکہ دونوں چل رہی ہیں مگر راکب (۶) کو اس وقت توقف (۷) کا وہم ہوتا ہے۔

غلطی کا منشاء

اسی طرح طریق باطن میں سالک کو کبھی توقف کا وہم ہوتا ہے مگر وہ توقف نہیں ہوتا واقع میں یہ چل رہا ہے لیکن اس کو اپنی سیر (۸) کا احساس نہیں ہے اور غلطی کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ترقی کے کچھ آثار غیر لازمہ ہیں، سالک ناواقفی سے ان کو آثار

(۱) کبھی دل نہیں بھرتا (۲) ٹھہرنے کا گمان ہوتا ہے (۳) حقیقت میں وہ چل رہا ہے (۴) اتنے ٹھہرنے کو بھی وقت کا ضائع کرنا سمجھتے ہیں (۵) جوڑ دیا جاتا ہے (۶) مسافر (۷) رکے ہونے کا گمان ہوتا ہے (۸) چلنے کا۔

لازمہ سمجھ کر ان کے انتفاء سے ترقی کے انتفاء پر(۱) استدلال کرتا ہے۔ پس حقیقی توقف اس سفر میں کبھی نہیں ہوتا اور کسی کو نہیں ہوتا سب برابر مشغول سیر ہیں(۲)۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ

سیر زاہد ہر دمے یکسالہ راہ سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ(۳)

اور حصول نسبت جس کو اصطلاح میں تکمیل کہتے ہیں اس کو تکمیل کہنا ایسا ہے جیسے طلباء کی دستار بندی کو تکمیل کہتے ہیں، کیا دستار بندی کے بعد سیر علمی(۴) ختم ہوجاتی ہے، ہرگز نہیں بلکہ اب تو پہلے سے زیادہ سیر شروع ہوتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ راستہ تو ابھی کھلا ہے اور صحیح سیر تو اب ہوگی۔ اے نو آموز طالب علمو! یہ مت سمجھنا کہ دستار بندی اور سند ملنے کے بعد بس کام ختم ہوگیا بلکہ اصلی کام کا وقت تو اس کے بعد آئے گا۔ آپ کمسن ہیں ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے۔

مگر جتنی محنت اس وقت کرلوگے اتنی ہی سرعت سیر(۵) بعد تکمیل کے نصیب ہوگی۔ پس سمجھ کر کتابیں پڑھو اور ان کو انسان بن کر اپنے اوپر لادو۔ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (مثل گدھے کے کہ لادتا ہے کتابوں کو) کا مصداق نہ بنو۔ اسی طرح تخت شاہ پر سالک کا پہنچنا اصطلاحی تکمیل ہے حقیقی تکمیل نہیں بلکہ اب تو اصلی سلوک شروع ہوتا ہے اور سیر کا راستہ اسی وقت کھلتا ہے یہاں حقیقی تکمیل کہاں کیونکہ اس راستہ کی انتہا ہی نہیں جو کسی حد پر حقیقی تکمیل ہوجائے۔

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دوید نہا کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا(۶)

اور مولانا فرماتے ہیں:

اے برادر بے نہایت در گہیست ہرچہ بروے می رسی بروئے مایست(۷)

---

(۱) ان آثار کی نفی سے ترقی کی نفی سمجھتا ہے (۲) سب مسلسل سفر میں ہیں (۳) ''زاہد ایک مہینہ میں ایک سال کی راہ طے کرتا ہے اور عارف ذرا سی دیر میں تخت شاہ تک پہنچ جاتا ہے اور تخت شاہ پر پہنچ کر بھی سیر ختم نہیں ہوتی'' (۴) علمی سفر (۵) تیز رفتار سفر (۶) ''محض دوڑنے سے طریق عشق ہرگز طے نہیں ہوتا اس لیے کہ مثل انگور کے کاٹنے سے خود بخود بڑھتا ہے'' (۷) ''بھائی! محبوب کی درگاہ کی انتہا نہیں ہے جس مقام پر پہنچو مت ٹھہرو آگے چلو''

عارف کو فنائے تام حاصل ہوجاتا ہے

اور یہاں سے ایک شبہ حل ہوگیا وہ یہ کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے مکتوبات میں جابجا قسم کھا کر یہ فرمایا ہے کہ واللہ میں کچھ نہیں ہوں، واللہ مجھے کچھ نہیں آتا، محض احباب کا حسن ظن ہے جو میرے ساتھ ہے۔ اس کلام سے ایک مطلب تو معاندین نے نکالا کہنے لگے کہ وہ واقعی ہم بھی مولانا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جب وہ خود قسم کھا کر اپنی نا قابلیت کا اظہار کرتے ہیں تو ہم ان کی قسم کو سچا کیسے نہ مانیں وہ جھوٹی قسم تھوڑا ہی کھا سکتے ہیں۔ واہ رے کوڑ مغز بلکہ کوڑ مغز کا بچہ اور یہ بچہ کہنا ایسا ہے جیسے محاورہ میں کہا کرتے ہیں، سور کا بچہ، سور نہیں کہتے بلکہ سور کا بچہ کہتے ہیں، یہ اس سے ابلغ ہے(۱)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا سور ہونا ایسا کامل صفت ہے کہ نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے۔ اس سے باپ کو گالی دینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کی صفت کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں کہ تُو پورا سور ہے ایسے ہی میں نے کوڑ مغز کا بچہ کہنے سے کمال وصف کا قصد کیا ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند(۲)

اور حقیقی مطلب نے بعض خواص کو بھی چکر میں ڈال دیا کہ وہ بھی اصل مراد تک نہ پہنچے۔ چنانچہ ایک شیخ بھی مولانا کے اس کلام کی وجہ سے تردد وخلجان (۳) میں مبتلا تھے، مجھ سے کہنے لگے کہ حضرت نے یہ بات قسم کھا کر کیسے فرمائی حالانکہ ہمارے نزدیک تو حضرت میں ہزار ہا کمالات اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اب ہم اپنے اعتقاد کی تغلیط کریں تو مشاہدہ کی تغلیط ہے(۴) اور اس کی تصدیق کریں تو حضرت کی قسم جھوٹی ہوئی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ نہ آپ اپنے مشاہدہ اور علم کی تکذیب کیجئے اور نہ حضرت کی قسم پر شبہ کیجئے، بات یہ ہے کہ جن کمالات کی بنا پر آپ حضرت کے معتقد ہیں، حضرت کی نظر ان کمالات پر نہیں ہے بلکہ ان سے آگے ہے وہ کمالات مستقبلہ متوقعہ (۵) کے اعتبار سے

(۱) یہ لغت زیادہ بلیغ ہے (۲) ''جب حقیقت کا پتہ نہ چلا بے تکی ہانکنے لگا'' (۳) پریشانی (۴) اگر ہم اپنے اعتقاد کو غلط کہیں تو اس سے مشاہدہ کی غلطی ثابت ہوتی ہے (۵) ان کی نظر مستقبل میں حاصل ہونے والے متوقع کمالات پر ہے۔

قسم کھا کر فرمارہے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں اور جن کمالات کو مولانا میں ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں یعنی کمالات واقعہ مولانا ان کی نفی نہیں فرمارہے (اور نہ ان کا اثبات فرماتے ہیں بلکہ ان پر حضرت کی نظر ہے نہیں کیونکہ عارف کی نظر اپنے کمالات پر نہیں ہوا کرتی اور اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو محض ان کو عطائے حق سمجھ کر ہوتی ہے اس وقت بھی مولانا کی قسم سچی ہے کہ واللہ میں کچھ نہیں ہوں کسی قابل نہیں ہوں یعنی جو کچھ میرے پاس ہے سب عطاء وفضل حق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب عارف کو فناء تام (۱) حاصل ہوجاتا ہے اور اس وقت اپنے کمالات پر تو نظر کیا ہوتی اپنے وجود پر بھی نظر نہیں رہتی بلکہ وہ تو یوں کہتا ہے۔ ''وجودك ذنب لا يقاس به ذنب'' (تیرا وجود ہی گناہ ہے اس پر کسی گناہ کو قیاس نہ کیا جائے گا) اب جو شخص اپنے وجود کو بھی ذنب (۲) سمجھے وہ کمالات کو اپنے لیے کیونکر ثابت کرے گا وہ تو بجز محبوب (۳) کے سب کی نفی کرے گا اپنی بھی اور اپنے کمالات کی بھی اس کا قسم کھا کر یہ کہنا کہ میں کسی قابل نہیں کچھ نہیں ایسا ہوگا جیسے ذرہ آفتاب کو دیکھ کر یہ کہے واللہ میں کچھ نہیں یا ''قل هو الله'' کا حافظ سبعہ قرآن کے حافظ کے سامنے یہ کہے کہ واللہ میں حافظ نہیں ہوں، پس حضرت کا قسم کھا کر یہ کہنا غلط نہیں کیونکہ ان پر جس درجہ انکشاف وجود (۴) حق وکمالات حق ہے اس درجہ میں ہر شخص یونہی قسم کھا کر اپنے کمالات کی نفی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ (مگر جاننے والا جانتا ہے کہ یہی خود بہت بڑا کمال ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچ گئے واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع)

تحدث بالنعمت

یہ تو ایک عارف کا کلام تھا جس کی میں نے یہ شرح کی اور الحمدللہ مجھے سب اہل اللہ کے کلام کا فہم عطا ہوا ہے میں مجذوبوں کے کلام کو سمجھ لیتا ہوں۔ چنانچہ ایک مجذوب وحشی کہتا ہے:

بیزارم ازیں کہنہ خدائے کہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست (۵)

کچھ ان کو بھی گالیاں کھانے ہی کا شوق ہے۔ ظاہر میں یہ کلام سخت وحشت ناک ہے (۶)

(۱) کامل فنائیت حاصل ہوجاتی ہے (۲) گناہ (۳) سوائے محبوب (۴) وجود حق تعالیٰ اور اس کے کمالات کھلتے جاتے ہیں (۵) ''اس کہنہ خدا سے جو تو کہتا ہے میں بیزار ہوں ہر روز میرا تازہ خدا اور ہے'' (۶) پریشانی کا باعث ہے

مگر مطلب سننے کے بعد وحشت نہ رہے گی۔ بات یہ ہے حق تعالیٰ کی کنہ (۱) کا علم تو محال ہے اسی لیے تصور بالکنہ کسی کو نہیں ہوسکتا جس کو بھی ہوتا ہے تصور بالوجہ ہوتا ہے اور تصور بالوجہ سے چارہ نہیں کیونکہ غائب کے ساتھ ارتباط قلب بدون کسی واسطہ اور وجہ کے نہیں ہوسکتا (۲) مگر جتنے وجوہ سے بھی تصور ہوتا ہے (۳) وہ وجہ ذات حق نہیں اللہ تعالیٰ اس سے منزہ اور وراء الوراء ہیں (۴)۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

اے بروں از وہم وقال وقیل من خاک برفرق من وتمثیل من (۵)

اس میں تو اللہ تعالیٰ کا تمام تمثیلات سے منزہ ہونا بیان کیا ہے اس کے بعد تمثیلات بیان کرنے کا عذر ظاہر کرتے ہیں۔

بندہ نشکیبد زتصویر خوشت ہردمت گوید کہ جانم مفرست

کہ عاشق کو بدون کسی تصور کے چین نہیں آتا اس لیے وہ آپ کے واسطے اچھی سے اچھی تمثیل بیان کرکے اپنی تسلی کرتا ہے اور اس میں بعض دفعہ وہ حد سے بھی بہت آگے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ

گر ترا گوید زمستی بوالحسن یا صغیرالسن یارطب البدن (۷)

مستی کی قید بڑھا کر بتلادیا کہ ایسی مثال بیان کرنا اور حق تعالیٰ کو صغیر السن وغیرہ کہنا جو بعض مجذوبوں کے کلام میں ہے محض مستی کا اثر ہے ورنہ واقع میں محبوب اس سے منزہ ہے اور بعض صوفیاء کے کلام میں دریا اور ہوا کی تشبیہ وارد ہے وہ بھی محض تسلی اور تفہیم کے لیے ہے ورنہ ذات حق اس سے بھی منزہ ہے بہرحال یہ تو معلوم ہوگیا کہ جس کو بھی تصور حق ہوتا ہے بالکنہ نہیں ہوتا بلکہ وجہ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن عارفین اور غیر عارفین میں اتنا فرق ہے کہ غیر عارفین کو تو عمر بھر ایک ہی وجہ سے تصور ہوتا ہے اور عارفین کو ہر دن نئے طریقہ سے نئی وجہ سے تصور ہوتا ہے کیونکہ ان پر

(۱) ذات کا علم (۲) غائب کے ساتھ دل بغیر کسی واسطے کے نہیں جڑتا (۳) جس صورت میں بھی ذات حق کا تصور کرے وہ ذات حق نہیں (۴) وہ تو اس سے بھی بالا وبرتر ہے (۵) ''اے اللہ آپ میرے وہم وخیال اور قیل وقال سے پاک ہیں، میرے سر وتمثیل پر خاک پڑے'' (۶) ''کبھی تجھ کو مستی سے بوالحسن یا کمسن یا رطب البدن سے تشبیہ دیتا ہے''۔

تجلیات کا ورود ہے(۱) ہر دن نئی تجلی ہوتی ہے۔ پس اس شعر میں اس مضمون کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اے زاہد تجھ کو جس وجہ سے تصور حق ہوتا ہے وہ وجہ کہنہ ہے میں اس سے بیزار ہوں مجھ کو تو حق تعالیٰ کا تصور ہر دن نئی وجہ سے ہوتا ہے یعنی میں روزانہ ترقی میں ہوں اور تو ایک ہی وجہ پر(۲) ٹھہرا ہوا ہے مگر کلام میں توحش اس لیے ہوگیا کہ اس نے وجہ تصور کو خدا سے تعبیر کیا ہے۔ زاہد کی وجہ کو کہنہ خدا کہہ دیا اور اپنی وجوہ متجددہ(۳) کو تازہ خدا کہہ دیا مگر مطلب معلوم ہوجانے کے بعد کچھ اشکال نہیں کیونکہ مجاز کا استعمال منکر نہیں۔ یہ گفتگو درمیان میں آ گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس راستہ کی انتہا چونکہ نہیں ہے اس لیے کسی حد پر تکمیل حقیقی نہیں ہوسکتی اور جس کو تکمیل کہا جاتا ہے اس سے تو سیر کا فتح یاب ہونا ہے کہ اب تک تو قاعدہ بغدادی پڑھ رہے تھے اس تکمیل کے بعد قائمہ بغدادی شروع ہوتا ہے یعنی پہلے تو بیٹھ بیٹھ کر چل رہے تھے، اب کھڑے کھڑے چلنا ہوگا، تکمیل درسی تو دو چار سال میں ہو جائے گی مگر تکمیل حقیقی تو درسی (۴) ہوگی جس کے معنی تیس سال میں اور یہ بھی حصر کے لیے نہیں بلکہ کثرت مراد ہے یعنی عمر دراز میں بھی نہ ہوگی۔ غرض نصوص (۵) سے اور اقوال صوفیاء سے ہمارا ہر وقت سفر میں ہونا وضاحت کے ساتھ ثابت ہے اس وقت ایک اور آیت یاد آئی۔ ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں: ''اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ'' کہ میں اپنے رب کی طرف چل رہا ہوں اس میں بھی سفر کے معنی ثابت ہیں اور حدیث نے تو مطلع بالکل صاف کر دیا۔ ''كُنْ فِی الدُّنْیَا كَاَنَّكَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ''(۶) کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے مسافر سرائے میں ہوتا ہے یا راستہ چلنے والا راستہ میں ہوتا ہے۔ اب تو ہمارا ہر دم سفر میں ہونا بالکل واضح ہوگیا، کوئی بات مخفی ہی نہ رہی۔ اب حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ یہ راستہ ہے تو سفر کا اور طویل راستہ ہے مگر حق تعالیٰ اس میں بندہ کی کیسی اعانت فرماتے اور اس کے حال پر کیسی عنایت فرماتے ہیں۔

(۱) اللہ کی تجلیات وارد ہوتی رہتی ہیں (۲) حالت پر (۳) نئی نئی صورتوں (۴) فارسی میں تیس کو سی کہتے ہیں یعنی تکمیل حقیقی تو تیسوی سال میں ہوگی (۵) قرآن وسنت سے (۶) الصحیح للبخاری: ۸/۱۱۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۷۴

جذب کی حقیقت

صوفیاء نے لکھا ہے کہ سلوک (۱) ایک خاص مقام تک ہوتا ہے اس کے بعد جذب (۲) ہوتا ہے (جذب کی حقیقت میں آگے بتلاؤں گا) اس کے بغیر کام نہیں چلتا جو لوگ گمراہ ہوئے ہیں وہ وہی تھے جو سالک محض تھے مجذوب نہ تھے جیسے ابلیس و بلعم بن باعور وغیرہ جذب کے بعد کوئی گمراہ نہیں ہوتا۔ الفانی لایرد (۳) کے یہی معنی ہیں۔ اب جذب کی حقیقت سنئے، جذب کے معنی ہیں لغت میں کشش کرنا، کھینچنا اور اصطلاح میں جذب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اس سے محبت ہوجائے جس کی علامت یہ ہے کہ سالک پر داعیہ اضطراریہ (۴) غالب ہوجائے اور اس سے کوئی واصل خالی نہیں ہوتا خواہ نقشبندی ہو یا چشتی۔ البتہ اکثر نقشبندیہ پر جذب کے آثار بادی النظر (۵) میں کم ظاہر ہوتے ہیں مگر اس دولت سے وہ بھی مشرف ہوتے ہیں۔ اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں:

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار اند کہ برنداز رہ پنہاں بحرم قافلہ را (۶)

اور حضرت شیفتہ ذکر خفی کی نسبت فرماتے ہیں:

چہ خوش ست باتو بزمے بنہفتہ سز کردن درخانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن (۷)

چشتیہ اور نقشبندیہ کا فرق

یہ چشتیت اور نقشبندیت محض الوان طریق (۸) کا نام ہے کہ چشتیہ کا لون یہ ہے کہ وہ اول تخلیہ کرتے ہیں پھر تحلیہ (۹) اور نقشبندیہ کا لون یہ ہے کہ وہ اول تحلیہ (۱۰) کرتے ہیں پھر تخلیہ اور یہ بھی متقدمین کا مذاق تھا اب تو دونوں طریق کے محققین کا فیصلہ

(۱) اللہ کے قرب کی طرف چلنا (۲) پھر تو اللہ پاک خود کھینچ لیتے ہیں (۳) جس نے خودی کو مٹادیا وہ مردود نہیں ہوتا (۴) بے اختیار تقاضہ (۵) سرسری نظر میں (۶) ''نقشبندیہ عجیب سالار قافلہ کہ مخفی راہ سے سالکین کو خدا رسیدہ بنادیتے ہیں'' (۷) ''یعنی وہ اس طرح سالک کو لے جاتے ہیں کہ دوسروں کو خبر بھی نہیں ہوتی مگر جذب سے وہ بھی خالی نہیں ہوتے مگر یہ مت سمجھنا کہ راہ مخفی سے لیجانا نقشبندیہ ہی کے ساتھ مختص ہے بلکہ چشتیہ بھی بعضوں کو اسی طرح پہنچاتے ہیں (۸) راستے کے مختلف رنگ (۹) پہلے قلب کو گناہ سے پاک کرتے ہیں پھر ذکر واذکار سے مزین کرتے ہیں (۱۰) پہلے آراستہ کرتے ہیں پھر مزین کرتے ہیں۔

یہ ہے کہ تخلیہ اور تحلیہ (۱) ساتھ ساتھ کرنا چاہیے۔ اب ہر محقق چشتی بھی ہے اور نقشبندی بھی لیکن یہ فرق ضرور ہے کہ باوجود دونوں کو جمع کرنے کے چشتیہ تخلیہ (۲) کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور نقشبندیہ تحلیہ (۳) کا اور اس فرق مذاق کی وجہ سے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ جس طالب کو جس لون سے (۴) مناسبت ہوتی تھی مشائخ اس کو ایک دوسرے کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ نقشبندیہ اپنے بعض مریدوں کو چشتیہ کے یہاں بھیج دیتے اور چشتیہ بعض طالبوں کو نقشبندیہ کے ہاں بھیج دیتے لیکن آج کل تو ہڑبونگ ہورہا ہے کہ اکثر مشائخ سب کو ایک ہی کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں باقی جو محقق ہیں وہ اب بھی طالب کو اس کی مناسبت کے موافق مشورہ دیتے ہیں، مولوی محمد منیر صاحب نانوتوی نے ہمارے حضرت حاجی صاحب سے پوچھا کہ حضرت میرے لیے خاندان چشتیہ میں بیعت ہونا مناسب ہے یا نقشبندیہ میں؟ حضرت نے فرمایا کہ پہلے تم ہمارے ایک سوال کا جواب دیدو پھر بتلائیں گے۔ ایک شخص ایسی زمین میں جس کے اندر جھاڑ جھنکاڑ (۵) کثرت سے ہیں تخم پاشی کرنا (۶) چاہتا ہے تو بتلاؤ تمہاری رائے میں اس کو پہلے جھاڑ جھنکاڑ صاف کرکے بعد میں تخم پاشی کرنا چاہیے یا اول تخم پاشی کردے؟ پھر رفتہ رفتہ جھاڑوں کو بھی صاف کرتا رہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میرے نزدیک تو اسے اول تخم پاشی کردینا چاہئے تاکہ کچھ تو ثمرہ حاصل ہوجائے ایسا نہ ہو کہ جھاڑوں کے صاف کرنے ہی میں عمر ختم ہوجائے۔ حضرت نے فرمایا کہ بس تم نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت ہوجاؤ تم کو انہی کے مذاق سے مناسبت ہے۔ سبحان اللہ حضرت نے دقیق مذاق کو کتنی سہل مثال سے حل فرمایا، پھر طالب کے مذاق کی کیسی رعایت فرمائی کہ صاف کہہ دیا کہ تم نقشبندیہ سے بیعت ہوجاؤ یہ نہیں کہ سب کو اپنے ہی یہاں بھرتی کرنے کی فکر کریں، جیسا آج کل اکثر ہورہا ہے۔ غرض چشتیت اور نقشبندیت کی حقیقت یہ ہے کہ تخلیہ اور تحلیہ (۷) کے بارے میں ان کا

(۱) ساتھ ساتھ دونوں کام کئے جائیں گناہ بھی چھڑاتے جائیں اور ذکر اذکار کی بھی تعلیم ہو (۲) ترک گناہ کا (۳) ذکر واذکار کا (۴) اصلاح باطن کے چار طریق ہیں۔ ۱۔ قادری۔ ۲۔ سہروردی۔ ۳۔ چشتی۔ ۴۔ نقشبندی (۵) گھاس پھونس (۶) بیج بونا چاہتا ہے (۷) اصلاح باطن کرنے میں ان کا مذاق مختلف ہے نقشبندی اول ہی ذکر کی تعلیم کرتے ہیں ساتھ ساتھ گناہ چھڑاتے ہیں چشتی پہلے گناہ چھڑاتے ہیں اخلاق درست کرتے ہیں پھر ذکر واذکار بتاتے ہیں۔

مذاق مختلف ہے یہ فرق نہیں جیسا کہ آج کل بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چشتیہ کے یہاں ذکر جہر ہے اور نقشبندیہ کے یہاں ذکر خفی، یہ تو ہر شیخ طالب کی طبیعت کے مناسب تجویز کرتا ہے خواہ چشتی ہو یا نقشبندی ہو۔ بہرحال جذب (۱) سے نقشبندیہ بھی خالی نہیں ہیں اور چشتیہ کا جذب تو مشہور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بدون جذب کے وصول نہیں ہوسکتا اور بدون وصول کے رجعت سے اطمینان نہیں ہوسکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجذوب خود بھی مطمئن ہوجائے۔ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ واقع میں اس پر رجعت کا خطرہ نہیں رہتا مگر خود کوئی مطمئن نہیں سالک نہ مجذوب بلکہ ہر شخص لرزاں وترساں ہے (۲)۔ مجذوب اس واسطے مطمئن نہیں ہوسکتا کہ جذب کا اس کو یقین نہیں ہوسکتا کیونکہ بعض دفعہ سلوک بصورت جذب نہیں ہوتا ہے (۳) جیسا کہ بعض جذب بصورت سلوک ہوتا ہے۔ نقشبندیہ کا جذب اکثر بصورت سلوک ہی ہوتا ہے اسی واسطے ناواقف اس کے جذب کو نہیں پہچانتا اور ان کو اس سے خالی سمجھتا ہے کیونکہ ان پر اس کے آثار ظاہر نہیں ہوتے لیکن وطن ان کا معمولی ہے۔ فرماتے ہیں:

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو کہ بینی خندہ برلب ہاؤ آتش پارہ دردل ہا (۴)

اور چشتیہ کا سلوک اکثر بصورت جذب ہوتا ہے جس سے ناواقف ان کو ابتداء ہی سے مجذوب سمجھنے لگتا ہے یہ بھی غلطی ہے تو معلوم ہوا کہ حقیقی جذب کی پہچان دشوار ہے ظاہری علامات اس کے ادراک کے لیے کافی نہیں ہیں۔ جذب کبھی شورش کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی سکون کے ساتھ لطیف ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

عشق معشوقان نہان ست دستیز عشق عاشق بادو صد طبل ونفیر (۵)

لیکن عشق عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش وقربہ کند (۶)

---

(۱) کھینچنے کی صفت سے (۲) خوف سے کپکپاتا رہتا ہے (۳) بعض مرتبہ سلوک کا راستہ جذب سے طے نہیں ہوتا (۴) ''اے افسردہ دل زاہد ایک دن رندوں کی مجلس میں جاکر دیکھ کہ دل میں آگ لگی ہوتی ہے اور لب پر ہنسی چھارہی ہے'' (۵) ''محبوبوں کا عشق پوشیدہ ہے عاشق کا عشق علانیہ ہوتا ہے'' (۶) ''لیکن عاشقوں کا عشق ان کو دبلا ولاغر کرتا ہے۔ معشوقوں کا عشق ان کو موٹا تازہ کرتا ہے''

عشق کی شان

جو شان عشق محبوب کی ہوتی ہے کہ اس میں شورش واضطراب (۱) نہیں ہوتا کبھی عاشق کا عشق بھی ایسی شان کا ہوتا ہے اور کمال کے بعد تو عشاق کے عشق کی اکثر یہی کیفیت ہوجاتی ہے اسی لیے کاملین کی محبت وعشق کا لوگوں کو پتہ نہیں چلتا، بعض لوگ اس کے سکون کو دیکھ کر کہتے ہیں ان کو محبت کی ہوا بھی نہیں لگی حالانکہ ان کو تو ایسی ہوا لگی ہے کہ کرہ ہوا سے پار ہوکر کرہ نار میں پہنچ کر اس سے بھی آگے نکل گئے، اب وہ ہنس رہے ہیں اور معترض سے کہتے ہیں:

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند (۲)

لوگ ان کو ہنستا ہوا دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ان کو محبت وعشق کا چرکہ نہیں لگا مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ وہ کتنی بلائیں اور مصیبتیں جھیل کر آج اس قابل ہوئے ہیں کہ وصال محبوب سے مسرور (۳) ہوکر ہنسیں اور آج سے پہلے ان کی بھی یہ حالت تھی کہ یوں کہہ رہے تھے۔

شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں ہائل کجا دانند حال سبکساران ساحلہا (۴)

میں اس کی شرح میں کہا کرتا ہوں کہ حافظ کی مراد ساحلہا سے ادھر کا ساحل ہے یعنی خوض (۵) دریا سے قبل کا ادھر کا ساحل نہیں یعنی عبور دریا (۶) کے بعد کیونکہ مبتلائے موج دریا کے حال سے بے خبر وہی لوگ ہیں جو ادھر کے ساحل پر کھڑے ہیں جنہوں نے دریا میں قدم بھی نہیں ڈالا اور جو لوگ ادھر کے ساحل پر کھڑے ہیں گو ظاہر میں وہ بھی دوسرے ساحل والوں کی طرح چین میں ہیں اور ہنس رہے ہیں مگر وہ مبتلائے موج کے حال سے بے خبر نہیں ہیں وہ اس خطرہ سے بھی واقف ہیں جس میں یہ بھی مبتلا گرفتار ہے اور اس کے علاوہ دوسرے خطرات سے بھی واقف ہیں کیونکہ وہ تمام دریا کو طے کر چکے

(۱) جوش وخروش (۲) ''تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کا حال کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا ومصیبت کی تلوار چل رہی ہے'' (۳) خوش ہوکر (۴) ''حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موج کا خوف ہو اور بھنور میں کشتی آگئی ہو تو اس حال کی ان لوگوں کو کب خبر ہوسکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں اور دریا میں قدم نہ رکھا ہو'' (۵) دریا میں گھسنے سے پہلے کا ساحل (۶) دریا کراس کر کے دوسری طرف کا ساحل مراد نہیں ہے

ہیں اور اس کے تمام ورطات (۱) سے خبردار ہو چکے ہیں وہ تو ایسے باخبر ہیں کہ خود بھی ان سے پار ہو کر نکل گئے اور دوسروں کو بھی نکال سکتے ہیں بلکہ نکال لیتے ہیں۔ اسی لیے ضرورت اس کی ہے کہ شیخ ساحل رسیدہ اور گرداب طے کردہ ہو (۲) یعنی صاحب تمکین ہو اور جو شیخ خود صاحب تلوین (مراد وہ تلوین ہے جو قبل از تمکین ہو اور تمکین کے بعد بھی تلوین پیش آتی ہے مگر وہ مشیخت میں قادح نہیں) ہو اس سے الگ ہو جانا چاہیے کیونکہ وہ تو ابھی اپنے ہی بچانے کی فکر میں ہے وہ دوسروں کو کیا بچائے گا تو خود ہی گرداب میں ہے دوسروں کو کیا خاک نکالے گا۔

صاحب تمکین اور صاحب تلوین

اسی حالت کو عارف شیرازی فرماتے ہیں:

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما چیست یاران طریقت بعدازیں تدبیر ما (۳)

یعنی جس شیخ پر خود ہی سکر غالب ہو وہ طالبین کی کیا تدبیر کرے گا۔ پس راہبر گرگ باران دیدہ (۴) کو بنانا چاہیے جو سرد و گرم سب چکھے ہوئے ہو اور صاحب تمکین گرگ باران دیدہ (۵) کی علامت یہ ہے کہ اس کی دو ہی باتوں سے سالک کی تسلی ہو جاتی ہے اور صاحب تلوین تو (۶) بہت بناتا ہے مگر سالک کی ان سے تسلی نہیں ہوتی اسی علامت کو مولانا فرماتے ہیں:

وعدہا باشد حقیقی دل پذیر وعہدا باشد مجازی تاسہ گیر (۷)

(۱) نشیب و فراز (۲) شیخ ایسا شخص ہو جو ساحل پر پہنچ گیا ہو اور سمندر کے تلاطم سے بھی واقف ہو (۳) ''کل ہمارے پیر مرشد پر سلوک سے حالت جذب طاری ہوگئی جس میں اصلاح نہیں ہو سکتی، اس کے بعد ہم یاران طریقت کو کیا تدبیر کرنا چاہیے کہ حالت سلوک واپس آئے اور ہماری اصلاح ہو'' (۴) پس شیخ ایسے شخص کو بنانا چاہیے جو تصوف کے سرد و گرم سے واقف ہو (۵) تجربہ کار آدمی ہونے کی (۶) سالک کے قلب کے حالات کا مختلف ہونا تلوین و تمکین کہلاتا ہے کبھی قبض ہو کبھی بسط کبھی سکر کبھی صحو، بالخصوص مبتدی کہ اس کو بہت تغیر پیش آتا ہے اس کو تلوین کہتے ہیں یہ لوازم سلوک سے ہے اس سے پریشان نہ ہو اور دوام طاعت و کثرت ذکر میں استقامت کے ساتھ مشغول رہنے سے حسب استعداد آخر میں مناسب حالت محمودہ پر قرار ہوتا ہے جس کو اصطلاح تصوف میں تمکین کہتے ہیں تمکین کے بعد تمام اشیاء کے حقوق بخوبی ادا ہوتے ہیں (۷) ''سچے وعدے دل کو لگتے ہیں، مجازی یعنی ناراست وعدے طبیعت میں تردد پیدا کرتے ہیں''

مولانا کی فارسی پہلے زمانہ کی فارسی ہے تاسہ کے معنی ہیں اضطراب مطلب یہ ہے کہ شیخ جو وعدہ کیا کرتا ہے کہ یہ حالت فلاں مقام کے حصول کی علامت ہے اور یہ کیفیت فلاں چیز کا اثر ہے اور اب یہ ہوگا تو یہ وعدے اگر صاحب تمکین کی زبان سے نکلیں گے تو سالک کی معاً تسلی وطمانیت ہوجائے گی اور صاحب تلوین کے وعدوں سے خاک اطمینان حاصل نہیں ہوتا بے اطمینانی رہتی ہے۔ حدیث میں بھی یہ مضمون ہے ''الصدق طمانينة والكذب ريبة''(۱) پس کاملین کو ان کی تمکینی حالت دیکھ کر عشق ومحبت کی کیفیات سے خالی نہ سمجھو۔ ان کا عشق پک گیا ہے اس لیے اب وہ اندر اندر اپنا کام کررہا ہے اور صاحب تلوین کا عشق خام ہے اس لیے دنیا جہاں کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔

کاملین کی مثال

کاملین کی ایسی مثال ہے جیسے پکی ہوئی ہنڈیا کہ آگ نے اس کے رگ وپے میں سرایت کرکے ہر چیز کو بھون دیا ہے اور چونکہ اندر تک آگ پہنچ چکی ہے اس لیے آواز نہیں آتی مگر وہ ٹھنڈی نہیں ہے ذرا ہاتھ لگاؤ گے تو بھون دے گی۔ پس کاملین ڈرتے تو اس لیے ہیں کہ بعض دفعہ پکنے کے بعد سکون ایسا کامل ہوتا ہے کہ خود ان کو بھی اپنی مستی کی خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنے کو جذب سے خالی سمجھنے لگے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ فی نفسہ وصول کے بعد اب ان پر ارتداد ورجعت (۲) کا اندیشہ نہیں رہا۔ مولانا نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ جیسے بالغ نابالغ نہیں ہوسکتا اور پکا ہوا پھل کچا نہیں ہوسکتا، گوسڑ جائے گا بس سڑ جائے گا مگر کچا کبھی نہیں ہوگا۔ واقعی مثال کے تو مولانا بادشاہ ہیں اور ان کی کوئی تخصیص نہیں، عموماً صوفیاء میں معانی کی تحقیق بلکہ اس کے ساتھ فصاحت لفظی بھی بے نظیر ہوتی ہے ان کو الفاظ بھی خوب ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ بالغ کسے کہتے ہیں، فرمایا کہ طبی بالغ تو وہ ہے جس سے منی نکلے اور حقیقی بالغ وہ ہے جو منی سے نکل جائے (یعنی خود اور کبر سے پہلا منی لفظ عربی ہے اور دوسرا فارسی لفظ ہے) اسی طرح ایک بزرگ دوسرے بزرگ کو جو زیادہ خرچ کرتے تھے لکھا ''لا خير

(۱) ''سچائی اطمینان بخش ہے اور جھوٹ تردد پیدا کرتا ہے'' مجمع الزوائد: ۱/ ۱۴۲ (۲) ان پر لوٹنے اور مرتد ہونے کا خوف نہیں رہتا

فی الاسراف ''(اسراف میں خیر نہیں ہے) تو دوسرے بزرگ نے ان ہی لفظوں کو الٹ کر جواب دیا'' لا اسراف فی الخیر '' کہ نیک کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں ہے۔ ایسے ہی کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ ایک بزرگ جارہے تھے، راستہ میں ہوا بہت تیز چلی جس سے میت کی تاریخ وفات نکلتی تھی۔ (یعنی انہوں نے تاریخ نکالی ''مٹی خراب '' بزرگ نے فرمایا یوں مت کہو بلکہ یوں کہوں مات بخیر

۱۲۵۳ ۱۲۵۳

(مرگیا خاتمہ بالخیر) اس میں بھی وہی تاریخ نکلتی ہے جو مٹی خراب میں نکلتی تھی انہیں حرفوں کو لوٹ پوٹ کر کیسا عمدہ مادہ بنادیا۔ غرض صوفیاء فرماتے ہیں کہ واصل راجع نہیں ہوتا(۱) اور اس کی مثال اوپر بیان ہوچکی اور اس کی بھی صوفیاء نے تصریح کی ہے کہ وصول بدون جذب(۲) کے نہیں ہوتا تو حق تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی عنایت ہے اور اس طویل راستہ میں انہوں نے کیسی سہولت فرمادی ہے کہ سلوک کے بعد خود ہی جذب فرمالیتے ہیں اور یہ صوفیاء کی گھڑت نہیں ہے۔

جذب وسلوک

بلکہ قرآن سے اس جذب کا ثبوت موجود ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۳)

اس آیت میں جذب وسلوک دونوں کا ذکر ہے مگر نہ اس طرح جیسے ایک جاہل نے کہا ہے کہ قرآن سے صوفیاء کے اشغال ثابت ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''سلطاناً نصیرا۔ ومقاما محمودا'' (ایک قوت مدد دینے والی) سے صوفیاء کی اصطلاح مراد ہے یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہاں ان الفاظ کے معنی لغوی مراد ہیں اور صوفیاء نے اپنی اصطلاح کو قرآن کے ان الفاظ سے لیا ہے۔ قرآن میں ان کی اصطلاح مراد نہیں ایسے ہی ایک جاہل نے کہا تھا کہ مولوی خواہ مخواہ کھانے پر فاتحہ دینے کو بدعت کہتے

(۱) جس کو وصول کی دولت نصیب ہوگئی ہو وہ واپس نہیں ہوتی (۲) اللہ تک وصول بغیر ان کے کھینچے نہیں ہوسکتا (۳) ''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کشش کرلیتے ہیں اور اپنی طرف سے ہدایت کرتے ان لوگوں کو جو ان کی طرف رجوع کرتے ہیں''

ہیں حالانکہ قرآن سے اس کا ثبوت ہے کہ قرآن میں ایک سورت ہی فاتحہ کے واسطے نازل ہوئی ہے اور اسی واسطے اس کا نام قرآن سے لے لیا ہے کہ اس عمل میں سورہ فاتحہ کو پڑھنے لگے اور اس کا نام فاتحہ رکھ دیا یہ الٹی منطق ہے کہ قرآن میں سورہ فاتحہ کا نزول اور اس کا نام اس عمل کے لیے ہے تو میں قرآن سے جذب (۱) کا ثبوت اس طرح نہیں دیتا بلکہ الفاظ قرآنیہ کو لغوی معنی پر رکھ کر اور تفسیر سلف کو بحال خود (۲) رکھ کر ثبوت دیتا ہوں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کشش کر لیتے ہیں اور اجتباء اور جبی کے معنی لغت میں کشش ہی کے ہیں اور جذب کے معنی بھی یہی ہیں تو اس سے صاف ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو اپنی طرف ہدایت جذب فرماتے ہیں۔ آگے ارشاد ہے: وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (اور اپنی طرف ہدایت فرماتے ہیں ان لوگوں کو جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں) اس میں سلوک کا بیان ہے کیونکہ سلوک کے معنی یہی ہیں انابت الی اللہ (۳) خدا کی طرف رجوع کرنا اور طلب میں مشغول ہونا سلوک پر فتح باب کا ترتب ہوتا ہے (۴) جس کو ہدایت فرمایا گیا ہے۔ وصول (۵) اس پر مرتب نہیں ہوتا وصول اجتباء اور جذب (۶) سے ہوتا ہے جب تک ادھر سے جذب نہ ہو وصول نہیں ہوسکتا جس درجہ کا بھی جذب ہوگا اسی درجہ کا وصول ہوگا۔ اگر جذب کامل ہے وصول کامل ہوگا اگر جذب قلیل ہے تو وصول بھی قلیل ہوگا (۷)۔ ایک بزرگ نے جذب کی حقیقت کو حسی مثال میں خوب بیان فرمایا وہ ایک بادشاہ کے بالاخانہ کے نیچے سے جارہے تھے، بادشاہ نے آواز دی کہ ذرا یہاں تشریف لائیے مجھے ایک سوال کرنا ہے۔ کہا کیوں کر آؤں تم اوپر میں نیچے، بادشاہ نے فوراً کمند لٹکا دی کہ اسے پکڑ لیجئے پھر بادشاہ نے کھینچ لیا، فوراً اوپر پہنچ گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم خدا تک کس طرح پہنچے، بزرگ نے بے ساختہ جواب دیا کہ جس طرح تم تک پہنچا، اگر میں ملنا چاہتا اور تم نہ ملنا چاہتے تو قیامت تک

(۱) کھینچنے (۲) سلف صالحین نے جو اس کی تفسیر بیان کی ہے اسی کو برقرار رکھتے ہوئے (۳) اللہ کی طرف رجوع کرنا (۴) ہدایت کے دروازے کھلتے ہیں (۵) قرب الٰہی (۶) قرب الٰہی جب ہی ہوگا جب اللہ اس کو اپنی طرف کھینچیں گے (۷) اگر کشش کامل ہے وصول بھی کامل ہوگا۔ اگر کامل نہیں وصول میں بھی اتنی ہی کمی ہوگی جتنی کشش میں۔

بھی میں آپ تک نہ پہنچ سکتا۔ تم نے خود ملنا چاہا تو خود ہی کھینچ لیا، اس طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنا دشوار تھا کیونکہ طویل راستہ کا قطع کرنا بندہ سے کہاں ممکن ہے اگر وہ ملنا نہ چاہتے تو قیامت تک وصول نہ ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت سے خود ہی ملنا چاہا اور کھینچ لیا جیسا تم نے کمند سے کھینچ لیا۔ سبحان اللہ اہل اللہ کو ذہانت بھی کیسی عطا ہوتی ہے مگر یہ جب عطا ہوتی ہے کہ پڑھا لکھا سب بھلادو پھر وہ خود علوم کو تمہارے دل میں نقش کرتے ہیں اور جب تک تم اپنے نقش کو نہ مٹاؤ گے اس وقت تک دوسرا نقش اس پر کیسے ہوگا مگر مٹانے کی توفیق بھی اسے ہی ہوتی ہے جس کو وہ کچھ دینا چاہتے ہیں۔ بس یوں کہو کہ جب وہ کچھ دینا چاہتے ہیں تو خود ہی پہلے نقش کو مٹا دیتے ہیں اور خود ہی دوسرا نقش قائم کر دیتے ہیں مگر خود بھی لگا رہنا ضرور ہے۔

محبت حق سبحانہ وتعالیٰ کا طریقہ

ایک بزرگ جو کہ ان پڑھ تھے محمد شیر شاہ ان کا نام تھا، ملا ہوں میں نے ان سے پوچھا کہ محبت حق کا طریقہ بتلایئے فرمایا ذرا اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑو، میں حیران ہوا کہ میرے سوال کا یہ جواب کیسا مگر تقلیداً میں نے ہاتھوں کو رگڑا، پوچھا کہو کچھ گرمی پیدا ہوئی، میں نے کہا ہاں ہوئی، فرمایا بس یوں ہی رگڑتے رہو، ایک دن گرمی پیدا ہو کر شعلہ محبت بھڑک جائے گا، دیکھئے معقول کو کیسا محسوس (۱) بنا دیا اور واقعی کیسا راستہ کو سہل بنا دیا، بس کام میں لگے رہو اسی طرح ایک دن کام بن جائے گا۔ اب میں اسی کام کو بتلاتا ہوں جو تمہارے کرنے کا ہے سو اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں انہیں میں لگنے سے کام بنتا ہے اور جو بھی پہنچا ہے انہی سے پہنچا ہے۔ میں اس وقت طریقت کا بھانڈا پھوڑ رہا ہوں (۲)، لوگوں نے خواہ مخواہ اندھیری کوٹھڑی میں ان کو ڈال کر مقفل کر رکھا ہے اس کو تو برسر ممبر کہنا چاہیے وہ دو باتیں یہ ہیں ذکر اور اطاعت مگر ان کا طریقہ کسی محقق سے دریافت کرو اپنی رائے سے تجویز نہ کرو۔ حضرت فرید عطار فرماتے ہیں:

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیرد پس برآ (۳)

(۱) ایک عقلی بات کو کیسے محسوسات کے ذریعہ سمجھا دیا (۲) حقیقت کھول کر بیان کر رہا ہوں (۳) ''اے دل اگر اس سفر محبت کے طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو دامن رہبر کامل کو مضبوط تھام اور پیچھے آ''

اور مولانا فرماتے ہیں:

یار باید راہ را تنہا مرد بیق قلاؤز اندریں صحرا مرد (۱)

قلاؤز کے معنی طاعنین کی اصطلاح کے اعتبار سے قل اعوذ (۲) نہیں بلکہ قلاؤز ترکی لفظ ہے بمعنی رہبر گو وہ قل اعوذ یا (۳) بھی ہو مگر راستہ کا جاننے والا ہو، محقق ہو، اس سے طریقہ دریافت کر کے ذکر و طاعت میں مشغول ہو ان شاء اللہ واصل ہو جائے گا۔ بس ان دونوں میں خلل نہ (۴) آئے باقی کیفیات واحوال کے درپے (۵) نہ ہو وہ سب انہی دو کی باندیاں ہیں اور جب تک محقق مل سکے اس وقت تک کتاب سے سلوک طے نہ کرو، کتابیں بھی مفید ہیں مگر وہ مریض کے لیے نہیں ہیں بلکہ طبیب کے لیے ہیں۔ یہ طبیب کے ذمہ ہے کہ مواقع اشکال میں قراباً دین (۶) وقانون کا مطالعہ کر کے علاج کرے۔ مریض کو ان کتابوں کا مطالعہ مفید نہیں اور ان کو مطالعہ کر کے شیخ سے معارضہ کرنا تو سم قاتل (۷) ہے وہ دامن جھاڑ کر الگ ہو جائے گا تمہاری کتاب تو انسان کامل یعنی شیخ ہے تم کو مشکل حل کرنا ہو اسی کے مطالعہ سے کرو اسی کو فرماتے ہیں:

وانت الکتاب المبین الذی باحرفه یظهر المظهر (۸)

اور فرماتے ہیں:

اے لقاء تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل سود بے قیل وقال (۹)

مطالعہ دینی کتب

ہاں اگر کسی کو شیخ محقق نہ ملے تو پھر کتابوں کا مطالعہ کرو مگر ان کتابوں کا جن میں علم معاملہ کا بیان ہو اصلاح نفس کے طرق مذکور ہوں اس وقت یہ کتابیں بھی بمنزلہ شیخ کے ہوں گی۔ عارف فرماتے ہیں:

---

(۱) ''ساتھی ضرور چاہیے تنہا راستہ مت چل خصوصاً اس طریق میں بلا رہبر کے ہرگز قدم مت رکھ'' (۲) یہ لفظ قل اعوذ نہیں ہے جس کے معنی پناہ مانگنے کے نہیں بلکہ ترکی لفظ قلاوز ہے جس کا مطلب اگرچہ وہ پناہ مانگنے والا بھی ہو (۳) اگرچہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جن سے پناہ مانگی ہے (۴) یعنی ذکر واطاعت میں فرق نہ آئے (۵) پیچھے نہ پڑے (۶) اصول کی کتاب دیکھ کر علاج کرے (۷) زہر قاتل (۸) ''اور تو واضح کتاب ہے جس کے حروف سے پوشیدہ اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں'' (۹) ''آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے اور ہر مشکل کا حل ہے''

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست صراحی مئے ناب وسفینہ غزل ست

جو زمانہ شیخ سے خالی ہو اس میں اس کے مکتوبات اور ملفوظات سے مستفید ہو اور یہ جبھی ہے کہ شیخ محقق میسر نہ ہو ورنہ اس کے ہوتے ہوئے کتاب کی کچھ ضرورت نہیں اسی کو دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

مقام امن ومئے بے غش ورفیق شفیق گرت مدام میسر شود زہے توفیق (۱)

رفیق شفیق سے شیخ ہی مراد ہے۔ بہرحال سالک کو شیخ کے نہ ملنے کے وقت یا شیخ کی اجازت کے وقت ان کتابوں کا مطالعہ بھی مفید ہوتا ہے جن میں طرق اصلاح اور علوم معاملہ مذکور ہوں۔

کتب علوم مکاشفہ واسرار کے مطالعہ کا حکم

اور جن کتابوں میں علوم مکاشفہ اور اسرار مذکور ہیں ان کو ہرگز نہ دیکھا جائے ان کے متعلق تو صوفیاء خود فرماتے ہیں: ''یحرم النظر فی کتبنا'' ہماری کتابوں کو دیکھنا حرام ہے ان کو صرف محقق ہی دیکھ سکتا ہے اور وہی ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اوپر جو میں نے کہا ہے کہ یہ باتیں تو برسرممبر کہنا چاہئیں ان سے بھی میری مراد علوم معاملہ وطرق اصلاح نفس ہی ہیں، علوم مکاشفہ واسرار (۲) مراد نہیں ان کو برسرممبر نہ کہنا چاہیے ورنہ مخلوق گمراہ ہوجائے گی۔ تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اس راستہ کو کتنا سہل بنادیا ہے کہ خود جذب فرمالیتے ہیں، میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے ہم کسی بچہ کو دور سے دیکھ کر ہاتھ پھیلادیں کہ ہماری گود میں آجا اور وہ شوق میں دوڑے اور دوقدم دوڑ کر گر پڑے۔ اس وقت ہم خود دوڑ کر اس کو اٹھالیتے ہیں اور اگر وہ چلے بھی نہیں تو ہم بھی نہیں لیتے، بس یہاں بھی اسی کی ضرورت ہے کہ تم اس طویل راستہ کے طے کرنے کا قصد کرکے چلو اور گر پڑو (یعنی عجز وعبدیت کا اظہار کرو) پھر حق تعالیٰ خود تم کو اٹھا کر منزل پر پہنچادیں گے اور اس سے زیادہ سہولت اور دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے مبدا سفر کو حکم دیا پیچھے ہٹنے کا، اور منتہائے سفر کو حکم دیا آگے بڑھنے کا، یعنی جس مسافت کو ہم طے کررہے ہیں اس میں تنہا

(۱) وہ علوم جن کا تعلق کشف واسرار الٰہی سے ہے (۲) راہ طریق میں ظاہر ہونے والے کشف اور اسرار ورموز۔

ہم ہی متحرک نہیں ہیں بلکہ اس سفر کا مبدا اور منتہا(۱) بھی محترک ہیں، مبدا پیچھے کو ہٹ رہا ہے ہم سے دور ہو رہا ہے اور منتہا آگے کو بڑھ رہا ہے ہم سے نزدیک ہو رہا ہے اب بھلا مسافت جلدی کیوں نہ ختم ہوگی جب تین چیزیں حرکت کر رہی ہیں کہ مسافر خود بھی منتہا کی طرف کو چل رہا ہے اور مبداء بھی بعید ہو رہا ہے اور منتہا بھی قریب ہو رہا ہے اور یہ میری گھڑت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ''الا ان الدنیا مدبرۃ والاخرۃ مقبلۃ'' کہ دنیا پیچھے کو ہٹ رہی ہے اور آخرت قریب ہو رہی ہے یہ تو سفر اضطراری کی حالت ہے اور سیر اختیاری جس کو سلوک کہتے ہیں اس کی بھی یہی حالت ہے جو بندہ طلب میں قدم رکھتا ہے اسی وقت سے موانع پیچھے ہٹنے لگتے ہیں یعنی خود بخود مرتفع ہونے لگتے ہیں اور مقصود قریب ہونے لگتا ہے

اور اس میں مبالغہ نہیں ہے جب حق تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہوتی ہے تو دنیا خود بندہ کو چھوڑ دیتی ہے اور موانع خود بخود مرتفع ہو جاتے ہیں اور یہ جزو اول ہے دعوے کا۔

تارک دنیا ہونا بڑا مشکل ہے

ہمارے ماموں صاحب فرماتے تھے کہ میاں تارک الدنیا ہونا تو بڑا مشکل ہے مگر جب توفیق حق شامل حال ہوتی ہے تو بندہ متروک الدنیا ہو جاتا ہے کہ دنیا خود اسے چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے اس نے بیوی کو طلاق دیدی اور بیوی نے خلع کر لیا اور اگر دنیا خود اسے نہ چھوڑے تو یہ لاکھ طلاقیں دے وہ لپٹتی ہے اور جہل سے یہی کہتی رہتی ہے کہ تیرے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے، میں نے تو طلاق قبول ہی نہیں کی۔ جیسے ایک جاہل عورت نے اپنے مرد کو یہی جواب دیا تھا اور دوسرا جزو دعویٰ اس حدیث میں مصرح ہے۔ ''من تقرب الی شبراً تقربت الیہ ذراعاً، الحدیث (۲) اور مبتداء ومنتہا کے پیچھے ہٹنے اور آگے بڑھنے کا ایک واقعہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص نے ۹۹ خون کیے تھے پھر اس کو توبہ کا خیال ہوا تو ایک عالم کے پاس گیا اور اپنا قصہ بیان کر کے مسئلہ دریافت کیا کہ اسی حالت میں میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں وہ کوئی

(۱) ابتداء وانتہاء (۲) ''جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز آتا ہوں'' مسند احمد: ۲/ ۴۱۳، کنز العمال: ۱۱۶۹۔

جلالی مولوی تھے، کہا تیرے واسطے توبہ کہاں یعنی کیا ۹۹ خون ایک ساعت میں معاف ہوسکتے ہیں، جا تیرے واسطے تو جہنم کا عذاب ہے سائل کو غصہ آیا، اس تلوار سے ان کا بھی خاتمہ کردیا کہ چلو سو میں ایک ہی کی کسر کیوں رہے۔ اس مولوی نے بھی تو اس کو قتل ہی کردیا تھا کہ غریب کو رحمت حق سے مایوس کردیا جس سے کفر کا اندیشہ تھا، شیخ کو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ طالبوں کو مایوس کرے۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ محض نجدی(۱) ہونا کافی نہیں وجدی(۲) ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ وہ مولوی محض نجدی تھا یعنی زاہد خشک اس لیے اس نے طالب کو مایوس کردیا۔ اگر وجدی بھی ہوتا تو اس کی طلب کو دیکھ کر پگھل جاتا۔

ایک صاحب تلوین درویش کی حکایت

رام پور ریاست میں ایک صاحب تلوین درویش تھا اس کو کسی مقام پر قبض ہو اور یہ یقین ہوگیا کہ میں مردود ہوگیا ہوں، تو اس نے خودکشی کا ارادہ کیا، پھر سوچا کہ لاؤ کسی دوسرے شیخ ہی سے اپنا حال کہوں شاید گرہ کھل جائے، وہاں ایک مشہور شیخ تھے ان کے پاس گیا، انہوں نے پوچھا کون ہو، کہا حضرت میں شیطان ہوں، شیخ نے جواب دیا کہ اگر شیطان ہو تو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ(۳) اس جواب سے سائل کو اپنی مردودیت کا یقین ہوگیا اور اپنے ایک مرید سے کہا کہ میں خودکشی کرتا ہوں، اگر کچھ کسر رہ جائے تو تم پورا کردینا۔ چنانچہ حجرہ میں جاکر اس نے گردن کاٹ لی اور مرید نے اندر جاکر دیکھا تو کچھ کھال الجھی ہوئی رہ گئی تھی اس نے اس کو بھی الگ کردیا، وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ لوگ آگئے اور مرید کو گرفتار کرلیا، اس نے کہا مجھے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں جب میرا شیخ خودکشی کرکے مرگیا تو مجھے ہی جینے کی کیا تمنا ہے تم شوق سے مجھے قتل کردو۔

احوال وجدی

پھر واقعہ کی تحقیق کی گئی تو مرید کی برات ثابت ہوئی اسے رہا کردیا گیا۔ یہ

(۱) زاہد خشک (۲) تصوف کی اصطلاح یعنی کیفیت وجد بھی حاصل ہو (۳) ''بجز اللہ تعالیٰ بزرگ وبرتر کے نہ گناہوں سے پھرنا اور نہ عبادت پر قوت ہے''

واقعہ ایک طالب علم نے جو میرے ہم سبق تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے بیان کیا۔ مولانا نے فرمایا افسوس ہم تو اس شیخ کو اب تک کامل سمجھے ہوئے تھے مگر معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں یونہی شہرت ہی شہرت ہے اس کو اتنی بھی خبر نہ ہوئی کہ سائل پر کیا حالت ہے اور اس کا علاج کیونکر کرنا چاہیے اور اگر اس نے اپنے کو شیطان کہا تھا تو ان کو جواب میں یوں کہنا تھا کہ پھر کیا مضائقہ ہے، شیطان بھی تو اسی کا ہے نسبت وتعلق تو اب بھی منقطع نہیں ہوا(۱)۔ اس جواب سے فوراً قبض (۲) کھل جاتا مگر ظالم نے لاحول پڑھ کر بے چارہ کو مایوس کر دیا۔ دیکھا آپ نے وجدی ایسے ہوتے ہیں جو طالب کو کسی حال میں مایوس نہیں کرتے بلکہ اس کے شریک غم ہوجاتے ہیں اور اس کے غم کو بٹا کر کچھ اپنے اوپر بھی لے لیتے ہیں۔ یعنی اس کی حالت پر غصہ نہیں کرتے بلکہ اس کی حالت پر غمگین ہوکر ورطہ (۳) سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب ان کی شرکت سے دو دل یک شود بکشند کوہ را (۴) ہمارے حاجی صاحب رات کو تہجد میں اکثر سورہ یٰسٓ پڑھا کرتے تھے اور اس کی حکمت میں یہ شعر پڑھتے تھے کہ جب دو دل مل جائیں تو یہ پہاڑ کو بھی توڑ دیتے ہیں اور یہاں تین دل ایک ہوجاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ایک مصلی کا دل دوسرا قلب اللیل، تیسرا قلب القرآن یعنی یٰسٓ جس کو حدیث میں قلب القرآن فرمایا ہے تو تین دل مجتمع ہوکر شیطان کو کیسے نہ بھگا دیں گے۔ خوب لطیفہ ہے غرض اس مولوی نے نجدیت سے کام لیا وجدی نہ تھا اس لیے طالب کو مایوس کر دیا۔

رحمت حق

پھر وہ ایک دوسرے عالم کے پاس گیا وہ یا تو محقق تھے یا پہلے واقعہ کو سن کر ان پر خوف طاری ہوگیا ان سے مسئلہ پوچھا تو جواب دیا کہ توبہ تو ہر مسلمان کے لیے ہے خواہ کیسا ہی گنہگار ہو، تمہاری توبہ کیوں نہ قبول ہوگی ضرور قبول ہوگی مگر تکمیل توبہ کے لیے ایک شرط ہے وہ یہ کہ جس بستی میں تم رہتے ہو اس کو چھوڑ دو یہاں کی صحبت اچھی نہیں تم فلاں بستی میں جا کر رہو، وہاں کے آدمی اچھے ہیں۔ یہ تو شرط لگانا بتلاتا ہے کہ یہ عالم محض

(۱) شیطان بھی اسی کی مخلوق ہے تو بندہ ومخلوق ہونے کی نسبت تو ابھی بھی باقی ہے (۲) گھٹن کی کیفیت ختم ہوجاتی ہے (۳) حیرت (۴) انکی شرکت سے دو دل ایک ہوگئے تو پہاڑ کو بھی ہٹا دیں گے۔

خائف ہی نہ تھا بلکہ محقق تھا۔ یہ جواب سن کر سائل نے توبہ کی اور چونکہ طلب کی شان پیدا ہوچکی تھی اس لیے تکمیل توبہ کے لیے وطن سے ہجرت بھی کی اور اس بستی کی طرف چلا جہاں کے لیے عالم نے وصیت کی تھی، کچھ ہی دور چلا تھا کہ موت کا وقت آ گیا۔

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

مگر اس نے اپنے کرنے کا کام اس وقت بھی کیا کہ عین نزع(۱) کی حالت میں بھی اس بستی کی طرف اس نے اپنا سینہ ابھار دیا اور کام تمام ہوگیا۔ اب رحمت حق کا کام دیکھئے چونکہ طالب اپنا کام کر چکا تھا اور وصول اس کے اختیار سے باہر تھا تو اب محبوب نے وصول کا خود انتظام کر دیا جس بستی سے اس نے چلنا شروع کیا تھا اس کو حکم ہوا تباعدی کہ تو دور ہوجا، پیچھے ہٹ جا اور جس بستی کی طرف یہ جارہا تھا اسے حکم ہوا تقاربی کہ تو قریب ہوجا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اجتہاد ملائکہ

اب ملائکہ رحمت وملائکہ عذاب دونوں آپہنچے اور ہر جماعت نے اس پر قبضہ کرنا چاہا، ملائکہ رحمت نے کہا اس کے مستحق ہم ہیں کیونکہ یہ توبہ کرکے اور گناہوں سے پاک ہوکے مرا ہے۔ ملائکہ عذاب نے کہا کہ نہیں یہ مستحق عذاب ہے کیونکہ تکمیل توبہ کی شرط متحقق نہیں ہوئی، ابھی صلحاء کی بستی میں بھی نہیں پہنچا تو توبہ کامل نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی بعض دفعہ اجتہاد کرتے ہیں، ہر کام صریح نص ہی سے نہیں کرتے۔ جب ان میں باہم اختلاف ہوا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ نے آکر یہ فیصلہ کیا زمین کو ناپ لو جون سی بستی قریب ہو اسی کے موافق حکم ہوگا۔ اگر قریہ اشرار(۲) سے قریب ہو تو اشرار میں داخل کردو(۳) اور قریہ ابرار(۴) سے قریب ہو تو ابرار میں داخل کردو۔ چنانچہ پیمائش کرنے سے ایک ہاتھ قریہ ابرار سے قریب نکلا، بس ملائکہ رحمت کے سپرد ہوا تو جس طرح یہاں حسًا مبدا کو بعید اور منتہا(۵) کو قریب کیا گیا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر سالک کے لیے معنی مبدا کو بعید اور منتہا کو قریب کردیتے ہیں۔ اب بتلایئے یہ

(۱) روح نکلتے وقت (۲) برے لوگوں کی بستی (۳) شریروں میں شامل کرو (۴) نیک لوگوں کی بستی (۵) جہاں سے چلا تھا وہ جگہ دور ہوگئی اور جہاں جانا تھا وہ قریب ہوگئی

راستہ کتنا آسان ہوگیا کہ حق تعالیٰ بندہ کو جذب بھی فرماتے ہیں اور جب تک سلوک رہتا ہے اس وقت بھی یہ سہولت کرتے ہیں کہ مبدا کو بعید ہونے کا اور منتہا کو قریب ہونے کا حکم دیتے ہیں بس اب اس سفر کے طویل ہونے سے گھبرانا نہ چاہیے۔

خلاصہ بیان

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ آپ ہر وقت سفر میں ہیں تو آپ کو مسافر کی طرح فکرمند اور بے چین رہنا چاہیے، بے فکر نہ ہوں، برابر عمل میں لگے رہئے اور اپنی طرف سے راستہ قطع کرنے کی برابر ہمت کیجئے پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات واعانات کا لطف دیکھئے کہ وہ کیونکر طویل مسافت کو قصیر(۱) اور دشوار گزار طریق(۲) کو پھولوں جیسا ہلکا بنادیتے ہیں۔ اگر کبھی سستی ہوجائے تو پھر از سرنو تجدید فکر کیجئے، اگر گناہ ہوجائے فوراً توبہ کرلیجئے اس سے پھر بند رستہ ہی پر آجاتا ہے، اب آیت کا ترجمہ کرکے میں بیان ختم ہی کرنے والا ہوں اور سچ یہ ہے کہ ختم اس واسطے بھی کررہا ہوں کہ اب مضامین ہی ذہن میں نہیں ہیں۔ ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''ان ھٰذہ تذکرہ'' کہ یہ قرآن اور یہ شریعت یادداشت ہے اس لفظ میں بھی ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ نعت میں تذکرہ اسی شے کو کہتے ہیں جو شے معلوم کی یاددہانی کرے تو اس میں اس طرح اشارہ ہے کہ یہ سفر ایسا ہے جو تم کو پہلے سے معلوم ہے مگر بھول گئے ہو تو یہ قرآن اس کی یاددہانی کرتا ہے باقی یہ کہ اس راستہ کے معلوم ہونے کی کیا دلیل۔ سو اس کو مولانا بیان فرماتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وزجد ایہا شکایت می کند(۳)
کز نیستاں تامرا ببریدہ اند — ازنفیرم مرد و زن نالیدہ اند(۴)
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق(۵)
ہرکسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش(۶)

(۱) لمبے سفر کو چھوٹا (۲) مشکل راستہ کو (۳) ''بانسری روح انسانی کی باتیں سنو کہ جدائی سے کیسی حکایت شکایت کررہی ہے'' (۴) ''مجھ کو نیستان (عالم ارواح) سے جدا کردیا گیا ہے تو اس درجہ شورشیون میں مبتلا ہوں کہ سننے دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے'' (۵) ''میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو خود کسی کے فراق سے پارہ پارہ ہوتا کہ اپنا درد اشتیاق کھولوں تب اس کی سمجھ میں آوے'' (۶) ''ہر شخص کا قاعدہ ہے جب اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصول کو ڈھونڈتا ہے''

صاحب ذرا تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دل سے اپنے ضمیر سے اپنی روح سے باتیں کیجئے وہ اس کا جواب دے گی کہ آپ کس سفر کو بھولے ہوئے ہیں، اس سے آپ کو مشاہدہ ہوجاوے گا۔ قرآن بتلا رہا ہے کہ بے شک یہ آپ کو بھولا ہوا سفر یاد دلا رہا ہے اور بتلا رہا ہے کہ تمہارا اصلی وطن یہ نہیں جہاں اب ہو بلکہ اور ہے جس کی طرف جا رہے ہو۔ اے صاحبو! اپنے وطن کو جا رہے ہو اور اتنی سست رفتار کہ بیٹھ بیٹھ کر چل رہے ہو اصل مکان کی طرف تو جانور بھی تیزی سے چلا کرتے ہیں۔ بیلوں کو دیکھئے کہ وطن کی طرف کس شوق سے قدم اٹھا کر چلتے ہیں، حیرت ہے کہ آپ انسان ہوکر بھی اپنے اصلی وطن کی طرف تیزی کے ساتھ قدم نہیں اٹھاتے۔ صاحبو! سستی نہ کرو تیزی کے ساتھ چلو تمہارا اصلی وطن اصلی مستقر آگے ہے۔ تم دنیا میں کہاں پھنسے رہ گئے اس کے ساتھ کیوں دل لگالیا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔ وَمَا تَشَآئُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں) اس میں اس کی تعلیم ہے کہ اگر کسی کو اپنے فہم یا عمل پر ناز ہو اور یوں سمجھنے لگے کہ میں نے راستہ کو بہت جلد طے کیا اور مجھے اس کی معرفت کامل ہے اور میری سیر دوسروں سے کامل ہے تو وہ اس مضمون سے اپنے ناز کا علاج کرلے کہ تمہاری مشیت حق تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے(۱) ان کے چاہنے سے کام بنا ہے اگر وہ نہ چاہتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس پر اگر یہ سوال ہو کہ پھر اس کی کیا وجہ کہ حق تعالیٰ نے کسی کے لیے تو وصول چاہا اور کسی کے لیے نہیں چاہا، سب کو واصل کردیتے تو اچھا تھا۔ اس کا جواب آگے ہے: اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا (بے شک اللہ تعالیٰ علم والے حکمت والے ہیں) کہ سب کے واصل نہ بنانے میں بھی حکمتیں ہیں اور کسی کے ساتھ تعلق مشیت ہونا کسی کے ساتھ نہ ہونا حکمت کا مقتضی ہے تم اس میں دخل نہ دو اللہ تعالیٰ خود سب باتوں کو جانتے ہیں اور جو کام کرتے ہیں حکمت سے کرتے ہیں۔

وجود کفر میں حکمت

ایک دفعہ میرے دل میں یہ خطرہ آیا تھا کہ تھانہ بھون شاہ ولایت صاحب کے مزار پر جو خرافات ہوتی ہیں اگر یہ نہ ہوتیں تو اچھا تھا چونکہ اس خطرہ میں تقدیر سے

(۱) تمہاری چاہت اللہ کی چاہت کے تابع ہے

منازعت تھی، اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی، رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی یوں کہہ رہا ہے۔

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد(۱)

فوراً میرا خطرہ رفع ہوگیا اور عالم میں خیر وشر ایمان وکفر سب کا مطابق ہونا منکشف ہوگیا۔

اسماء الٰہی کی قسمیں

محققین نے اس حکمت کو اس سے زیادہ واضح بیان فرمایا ہے کہ صفات الٰہیہ جمیل ہیں اور جمال مقتضی ظہور کو ہے بس اسماء بھی مقتضی ہوں گے، ظہور کو اور اسماء کی دو قسمیں ہیں، جمالیہ، جلالیہ پس بعض کائنات مظہر ہیں۔ جمال کے بعض جلال کے اس لیے عالم میں خیر وشر کا ہونا ضروری ہے لیکن اقتضاء سے مراد معنی لغوی نہیں ہے تاکہ اضطرار کا شبہ کیا جائے بلکہ اصطلاحی معنی مراد ہیں وہ اپنی اصطلاح میں مطلق ترتب کو بھی اقتضاء سے تعبیر کردیتے ہیں۔ گو ترتیب درجہ لزوم وجوب میں نہ ہو اسی لیے تو ان کتب کے مطالعہ کی ہر شخص کو اجازت نہیں دی جاتی کہ لوگ ان اصطلاحات ورموز سے ناواقف ہیں۔ بس اب ختم کرتا ہوں، دعا کیجئے حق تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں اور ہم سب کو اپنے راستہ میں سہولت وجذب عطا فرمائیں۔ آمین (۲)

(۱) ''عشق کے کارخانہ میں کفر کا ہونا ضروری ہے، دوزخ میں کون جلتا اگر ابولہب نہ ہوتا'' (۲) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو ان مضامین سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی
۹/۱/۲۰۲۰

❁❁❁

کرونا وائرس و دیگر امراض سے بچاؤ کے وظائف

۞ تین مرتبہ اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ فَاللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظاً وَّھُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ

۞ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل (تین سو تیرہ مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیں)

۞ آیت کریمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (سورۃ لانبیاء:۸۷) زیادہ سے زیادہ پڑھیں، وقفے وقفے سے کچھ مقدار پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیں۔

۞ بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اِسْمِہٖ شَیْئٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم (ترمذی:۵۹۴۶) ہر کھانے اور پینے کی چیز سے پہلے ایک مرتبہ یہ دعا پڑھ لیں۔

۞ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی مصیبت زدہ کو دیکھے اور یہ دعا پڑھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا (ترمذی: ۳۴۳۱) تو وہ زندگی بھر اس مرض و وباء سے محفوظ رہیگا۔

نوٹ: جب کسی مریض کو دیکھیں یا کسی مریض کے بارے میں سنیں یا کسی اخبار وغیرہ

میں پڑھیں تو ایک مرتبہ مذکورہ دعا، مذکورہ فضیلت حاصل کرنے کے لیے پڑھیں۔

۞ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا یَجِیْئُ بِهِ الرِّیْحُ۔(ترمذی:۳۵۲۰)

اے اللہ میں ہر ایسی وباء سے تیری پناہ میں آتا ہوں جسے ہوا لیکر آتی ہے۔

نوٹ: فرض نمازوں کے بعد کی جانے والی دعا میں اور دیگر مواقع میں کی جانے والی دعاؤں میں یہ دعا ضرور پڑھیں۔

ان شاء اللہ مذکورہ اعمال کی برکت سے اللہ تعالیٰ کرونا وائرس اور دیگر امراض سے ہماری حفاظت فرمائیں گے۔

آمین یارب العالمین

۞۞
۞

أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی

ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاھور

۱۔ الحمد للہ جامعہ میں اس مرتبہ تعلیمی سال کا اختتام حسب سابق تکمیل بخاری شریف (منعقدہ 8 مارچ بروز اتوار) کے ساتھ ہوا مولانا ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی نائب مہتمم جامعہ ہذا نے کتاب کی تکمیل کرائی اور تقریب کے اختتام پر مولانا فضل الرحیم صاحب دامت برکاتہم العالیہ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور نے طلباء کو بخاری شریف کا آخری سبق پڑھایا، اس سال جامعہ سے 29 طلباء نے دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی اللہ تعالی تمام فضلاء سے اشاعت دین اور حفاظت دین کا کام لیں۔ آمین یارب العالمین۔

۲۔ جامعہ کی طرف سے ''مواعظ حکیم الامت'' کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کے پہلے شمارہ کی مقبولیت اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے خوب پذیرائی کے بعد دوسرا شمارہ ''آداب المساجد'' جس کا انگریزی عنوان ''Respect of Mosques'' ہے اس وقت طباعت کے مراحل میں ہے، ان شاء اللہ جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر اہل ذوق کے ہاتھوں میں ہوگا۔

۳۔ ملک میں پھیلے ہوئے کرونا وائرس کے بدولت وبائی مرض کی وجہ سے تمام تر تعلیمی اور دیگر کاروبار زندگی معطل ہوکر رہ گیا ہے، اسی سلسلہ میں دارالعلوم اسلامیہ میں بھی حکومت پنجاب کی طرف سے جاری کردہ اعلامیہ کی بنیاد پر 5 اپریل 2020ء تک تمام تعلیمی شعبہ جات میں عام تعطیل کی گئی ہے، جامعہ کے سالانہ امتحانات بھی مؤخر کیے گئے، حالات کے سازگار ہونے پر اس بارے میں نئے لائحہ عمل کا اعلان کیا جائے گا۔

جامعہ کے اساتذہ، اکابرین اور طلباء اپنے اپنے گھروں میں ملک وملت اور پوری انسانیت کے لیے اس وبائی مرض سے حفاظت کے لیے دعا گو ہیں اور اپنے تمام قارئین سے بھی درخواست کی جاتی ہے کہ استغفار اور آیات کریمہ کا کثرت سے ورد رکھیں اور پوری انسانیت کے لیے دعاؤں کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ جلد اس وبا سے پوری انسانیت کو مامون فرمائیں۔ آمین بجاہ النبی الامی الکریم

۴۔ حضرت مولانا قاری ڈاکٹر احمد میاں تھانوی صاحب مدظلہ العالی نے گزشتہ ماہ پاکستان کے مختلف شہروں میں دینی تقریبات میں شرکت فرمائی۔

- 6۔ مارچ 2020ء مسجد خلفاء راشدین۔ کراچی
- 7۔ مارچ 2020ء ادارہ معارف القرآن۔ کراچی
- 9۔ مارچ 2020ء معہد الحسن پی آئی اے سوسائٹی۔ لاہور
- 10۔ مارچ 2020ء قاری مشتاق رحیمی صاحب کے مدرسہ۔ قصور
- 12۔ مارچ 2020ء اشرف العلوم۔ گوجرانوالہ
- 13۔ مارچ 2020ء جامعہ محمدیہ۔ فیصل آباد
- 14۔ مارچ 2020ء ادارہ معارف القرآن۔ راولپنڈی
- 15۔ مارچ 2020ء جامعہ اسلامیہ۔ مردان
- 16۔ مارچ 2020ء اقرأ روضۃ القرآن۔ پشاور

❁❁❁